INTERNATIONAL EDITION

TOUCH OF CLASS

اُردو نثری اَدب میں جدید خاکہ نگاری کا نقطۂ آغاز

عرفان احمد خان

مشہور شخصیات کے دلچسپ اور منفرد خاکے

مصنف: عرفان احمد خان

ٹی اینڈ ٹی پبلشر

بنک کالونی سمن آباد لاہور 54500

0332-4191687-0300-4822090

فہرست مضامین

عطاءالحق قاسمی ــــــــ میری پسندیدہ خوشبو POISON

مجھے عطاءالحق قاسمی کی پیدائش سے سروکار ہے نہ وفات سے۔عزیز (براہ کرم اسے عُز یز نہ پڑھا جائے) ہے تو وہ جذباتی تعلق جو TEENایج میں اکثر ہوجاتا ہے۔عطاءالحق قاسمی سے غائبانہ تعارف تو گھر میں آنے والے''نوائے وقت'' کی وجہ سے تھا مگر پہلی ملاقات 19 سال کی عمر (1979ء) میں کراچی سے واپسی پر ہوئی، جب میں اپنی زندگی کے اوّلین رومانوں میں سے ایک کی گرفت میں تھا۔اپنی اُسی محبوبہ کی نظروں میں اپنا مقام بنانے کے لیے میں اپنی کوئی چیز اخبار میں شائع کروا کر اُن کے پورے گھر پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔مجھے وہاں سے جو لائن دی گئی تھی وہ FIRST DESERVE THEN DESIRE تھی۔سال کے 12 مہینوں کے حوالے سے لکھی ہوئی جانے کس مظلوم شاعر کی نظم مجھے میری سنگدل محبوبہ نے اپنے نام سے چھپوانے کے لیے دی تھی۔یہ ویسا ہی TEST CASE تھا، جیسا کسی زمانے میں شہزادیاں، شہزادوں کو آزمائش میں ڈالا کرتی تھیں۔ویسے تو''شہزادہ'' عطاءالحق قاسمی کا نک نیم ہے مگر میں بھی، اُن دنوں جذباتی سیلاب میں بہتا ہوا ایک شہزادہ ہی تھا اور شہزادوں ہی کی طرح نتائج سے بے پرواہو کر حالات سے ٹکرا جایا کرتا تھا۔

عطاءالحق قاسمی کو اتفاق (اتفاق فاؤنڈری نہیں) سے میں نے''نوائے وقت بلڈنگ'' سے باہر نکلتے وقت جا پکڑا۔وہ اپنے نیلے رنگ کی جاپان اسمبل سوزوکی موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے نکلنے ہی والے تھے۔میں نے مختصر ترین الفاظ میں اُن کی تعریف کی اور ملاقات کی غرض و غایت بیان کی۔اُنھوں نے میری محبوبہ کی دی ہوئی نظم مجھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔مجھے کاغذ پر اپنے کرائے کے گھر کا پتہ لکھ کر دیا جو ونڈسر پارک، اچھرہ، لاہور کا تھا۔

میری خوشی کا اُس وقت کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب ایک روز اچانک میں نے وہی نظم عطاءالحق قاسمی کے کالم میں لگی دیکھی۔کالم میں نظم کے ساتھ میرا حوالہ بھی موجود تھا۔میں نے اُس کالم کی فوٹو کاپی (جو اُن دنوں خاصی مہنگی تھی) کروا کر فوری طور پر کراچی پوسٹ کر دی اور بعد میں ایک سرکاری فون سے مفت لگا کر اس کارنامے کی داد بھی وصول کی۔پھر ایک دن میں عطاءالحق قاسمی کے دیئے ہوئے پتے پر رات کے وقت شکریہ ادا کرنے پہنچ گیا۔میں اپنے ساتھ مٹھائی اور کیمرہ بھی لے کر گیا تھا تا کہ عطاءالحق قاسمی کے ساتھ تصویر اُتروا کر اپنی محبوبہ پر مزید ملبہ ڈالا جاسکے۔میں ونڈسر پارک سائیکل پر پہنچا ہی تھا کہ زبردست آندھی نے آلیا۔قاسمی صاحب سے ملاقات کے وقت میں اُن کا مداح کم اور آفت زدہ زیادہ لگ رہا تھا۔قاسمی صاحب نے بڑی محبت اور اپنائیت سے مجھے پہلے نہا کر فریش ہوجانے کو کہا اور پھر کشمیری ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے بڑا مزیدار کھانا بھی کھلایا۔گھر کی حدود میں تھے اس لیے بوجوہ لطیفے نہ سنا سکے۔عمر قاسمی اُس وقت سال ڈیڑھ سال کا تھا، وہ اپنے ابو کو تصویر اُترواتا دیکھ کر رننگ دھڑنگ اپنے ابو کی گود میں آ گیا۔میں نے باپ بیٹے کی یہ بے تکلفانہ تصویر اُتار لی اور نیو ملینیم میں اپنی کتاب''اردو کی آخری مکمل کتاب PART-I''میں اس کیپشن کے ساتھ شائع کر دی:''مدیر معاصر عطاءالحق قاسمی کی گود میں نائب مدیر عمر قاسمی، امجد اسلام امجد کی معاصر سے چھٹی کروانے کے بعد خوشگوار موڈ میں۔''

عطاءالحق قاسمی کے والد صاحب بہاؤالحق قاسمی صاحب سے بھی وہاں پہلی ملاقات ہوئی۔بڑے ملنسار، حلیم الطبع اور نورانی صورت بزرگ تھے۔ایک عرصے بعد عطاءالحق قاسمی نے اُن کے حوالے سے یہ جملہ بھی کہا تھا:''لوگوں کی اولاد تابعدار ہوتی ہے ہمیں والدین تابعدار ملے تھے''میں نے جب اپنے والد صاحب کو بتایا کہ عطاءالحق قاسمی میرے دوست ہیں تو پہلے انہیں یقین نہ آیا غالباً مجھے TEST کرنے کی

غرض سے انہوں نے کہا کہ قاسمی صاحب کو کبھی چائے پر گھر تو بلاؤ۔ میرے کہنے پر ایک دن قاسمی صاحب آ گئے۔ یُوں میرے والد صاحب کو مجھ پر فخر محسوس ہوا کہ کالم نگار عطاء الحق قاسمی میرا دوست ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد عطاء الحق قاسمی نے M.A.O کالج میں اپنے لیے مختص کمرے میں ملاقات کے دوران بتایا کہ علامہ اقبال ٹاؤن کے جہاں زیب بلاک میں اُن کے اعزازی کم ذاتی گھر کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، جسے میں کسی دن دیکھنے آؤں۔ کالج والا نجی عقوبت خانے جیسا سیلن زدہ کمرہ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کسی قناعت پسند، لومیرج کرنے والے جوڑے کی طرح شیئر کرتے تھے اور اُف نہیں کرتے تھے۔ کالج کا نام اور مقام ایسا تھا کہ دونوں کالج کم کم ہی جاتے تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں پر طلباء سے بھی کہیں زیادہ توجہ دیتے تھے۔ کبھی کالج میں اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے مشاعرہ کروا دیا یا ضیاء الحق کی طرف سے دوطرفہ ہوائی ٹکٹ معہ لفافہ موصول ہوتے ہی ''بھاگ لگے رہن'' کی بُلبلی مارتے ہوئے اسلام آباد روانہ ہوگئے۔ حاکم وقت کو خوش کرنا بھی تو ہر سرکاری ملازم کے حلف کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی جہاں ضیاء الحق پوری پاکستانی قوم کے لیے خوفناک عفریت کی حیثیت رکھتا تھا وہیں یہ دونوں لیکچرر صاحبان اُسے ہنسا ہنسا کر مار دینے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے عطاء الحق قاسمی نے اُسی وقت سے خفیہ سفارت کاری کی ریہرسل شروع کر دی ہو اور مجیدے ٹنڈ اور سُرمے والی سرکار کے درمیان وچولے کا کردار وہی ادا کرتے ہوں۔

عطاء الحق قاسمی کا مکان کھڑا ہو رہا تھا۔ پلستر ہونے لگے تھے۔ میرا گھر عطاء الحق قاسمی کے زیر تعمیر گھر سے قریب ہی تھا۔ عطاء الحق قاسمی نے مجھے سیڑھیوں کے اوپر ڈیزائن کروائی ہوئی ذاتی لائبریری بڑے شوق اور فخر کے ساتھ دکھائی۔ مجھے بھی یہ سب اچھا لگا۔ اس وقت حلال وحرام کی کوئی خاص پہچان اور تمیز بھی نہ تھی۔ خیر مکان مکمل ہوگیا اور پھر اُس مکان میں میرا کئی بار آنا جانا ہوا۔ میں نے عطاء الحق قاسمی کے ڈرائنگ روم میں جن لوگوں کو بیٹھے دیکھا اُن میں نمایاں نام فخر گورڈن کالج، راول پنڈی ڈاکٹر اجمل نیازی، مفرور پبلشر طاہر اسلم گورا اور الحمد پبلی کیشنز کے مالک اور کلرک ایسوسی ایشن کے صدر صفدر حسین بھی تھے۔ صفدر حسین تو عطاء الحق قاسمی کے پبلشر بھی تھے اور ''معاصر'' کی اشاعت انہی کے ذمہ تھی۔ اُس وقت حاصل پور کا حسن عباسی حصولِ رزق کے لیے لاہور نہیں ٹپکا تھا۔ عُزیر احمد (گجر) کا بھی دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ ہر انسان اپنی صحبت اور دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی پہچان احمقانہ انداز میں آنکھیں جھپکاتا ہوا جھمکو عُزیر احمد گجر، سُنتِ شریفیہ ادا کرتے ہوئے اپنے سر پر گھنے بال سجانے والا حسن عباسی اور کھلے مونہہ والی بوتل ڈاکٹر صغریٰ صدف ہیں اور دوسری طرف خود عطاء الحق قاسمی شریف برادران سے دوستی کا دعویدار ہے۔ ایسی صورت میں ان سب کی ذہنی بحالی میں اضافے کی دُعا ہی کی جاسکتی ہے جو UTILITY STORE پر نہیں ملتی، پیدائشی ہوتی ہے یا پھر اچھی صحبت میں رہنے یا کرنے کروانے سے بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر عطاء الحق قاسمی نے تو ONEWAY TICKET لے رکھا ہے دوستی کا، وہ یہ سب OPTIONS کہاں استعمال کرے گا؟

عطاء الحق قاسمی نے اپنا مکان سرکاری پلاٹ پر اُس دور میں بنایا تھا جب سعودی شاہی خاندان کی ذاتی زکوۃ سے پورے پاکستان میں خوشحالی تھی۔ افغان جہاد کی برکتیں ہی برکتیں تھیں۔ عطاء الحق قاسمی نے نیلی سوزوکی موٹر سائیکل بچوں کو ہاتھ سیدھا کرنے کے لیے دے کر اب نیلے رنگ کی سوزوکی کار لے لی تھی۔ نیلی پر چڑھنے کا شوق عطاء الحق قاسمی کو ہدایتکار یونس ملک سے بھی کہیں بڑھ کر تھا جس نے نیلی کو فلمی دنیا میں پہلی بار متعارف کروایا تھا۔

''جنگ'' (کراچی) جو میرے والد صاحب اتوار کے اتوار کراچی سے منگوا کر دوپہر یا شام کے وقت بڑے شوق سے پڑھتے تھے کے مالک میر خلیل الرحمن مشرق (لاہور) کو بلا مقابلہ بکتے نہ دیکھ سکے اور انھوں نے اپنا پہلا دفتر علامہ اقبال روڈ، لاہور پر کرایہ کی بلڈنگ میں

بنایا۔ حسن رضوی، تنویر ظہور اور کچھ دوسرے صحافیوں نے لپک جھپک کر وہاں اپنی جگہ بنائی۔ حسن رضوی نے عطاء الحق قاسمی کو بھی جنگ لے جانے کی بہت کوشش کی مگر عطاء الحق قاسمی نے اُسے یہ کہہ کر چپ کروا دیا: ''صحافت میری نماز ہے اور مجید نظامی اُس کا وضو ہیں۔'' بعد میں جب عطاء الحق قاسمی نے جنگ کی چمک سے چندھیا کر جنگ جوائن کر لیا تو میں نے قاسمی ہی کے جملے میں عرفانی ترمیم کی: ''صحافت میری نماز ہے اور مجید نظامی اس کا وضو ہیں جو حالت ''جنگ'' میں ٹوٹ بھی سکتا ہے'' اُن کی اہلیہ نے بھی اُن کو جنگ جانے سے یہ کہہ کر روکا: ''اگر آپ کا نوائے وقت سے کوئی اصولی اختلاف نہیں تو کوئی ضرورت نہیں جنگ جانے کی۔'' اُن کی اہلیہ کے یہ تاریخی الفاظ عطاء کے طویل انٹرویو پر مبنی کتاب ''یہ نصف صدی کا قصّہ ہے'' مصنف: از ہر منیر میں پڑھے جا سکتے ہیں جو خود عطاء الحق قاسمی نے نصف صدی کے بعد اپنی جون بدلنے کی غرض سے غائب کروا دی کیونکہ لفظ کی حرمت کے تو وہ قائل ہیں اور اس کتاب کے آئینے میں وہ خود فطری لباس میں دکھائی دے رہے تھے۔ کتاب کے پبلشر لیاقت علی ''تخلیقات'' کا اب تک اس کتاب کے غم میں رو رو کر برا حال ہے۔ عطاء الحق قاسمی تو دور کی بات ہے، حسن عباسی اور عزیر احمد گجر تک کو اُسے دلاسہ دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔

مزاح نگاروں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کا مذاق تو جی بھر کر اُڑاتے ہیں لیکن اگر کوئی خود اُن کو نشانہ بنائے تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مزاح نگار بھی وہ جو حاکم وقت کو لطیفے سنا تا ہو کب برداشت کرے گا کہ کوئی اُسے بھی اپنی مزاحیہ سان پر رکھے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے نئے گھر کا نام ''العطاء'' رکھا تھا۔ اتفاق سے یہی نام مختار مسعود کے شادمان والے گھر کا بھی ہے۔ کچھ ایسا ہی اتفاق اُن کے کالموں کے مجموعے: ''کالم تمام'' کے ساتھ ہوا جو جانے کیسے پروین شاکر کے کلیات ''ماہِ تمام'' کے وزن پر رکھا گیا۔ اُن کے گھر پر تو سرکاری برکتیں نازل ہوئیں مگر ''کالم تمام'' وہ منحوس کتاب قرار پائی جسے سنگ میل جیسے ادارے نے 70% ڈسکاؤنٹ پر مارکیٹ میں پھینکا۔ عطاء الحق قاسمی جیسے ڈان کے کہنے پر ''حلقۂ عطائیہ'' کے ہر رکن کی یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ یہ مجموعہ جیسے بھی ہو فٹ پاتھوں پر سے تو اُٹھائے۔ یُوں خدا خدا کر کے جنرل ایوب خان کی خودنوشت کی طرح اس کتاب سے قارئین کی جان چھوٹی۔

عطاء الحق قاسمی نے ''العطاء'' کے باہر لیٹر بکس بھی لگوایا تھا جس کی سب سے زیادہ سہولت مجھے تھی۔ اُن دنوں میرے اندر ایک رائٹر اُبھر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کا الٹرا ساؤنڈ کر کے اُسے بتایا جائے کہ وہ آخر ہے کیا؟ میں کالم نما کچھ چیزیں لکھ کر عطاء الحق قاسمی کے لیٹر بکس میں ڈال آتا اور کالم آنے کے انتظار میں رہتا۔ اپنے کچھ کالموں میں عطاء الحق قاسمی نے نام لے کر میرا ذکر بھی کیا۔ میرے کچھ کالموں سے مرکزی خیال لے کر عطاء نے اُسے کیا سے کیا بنا دیا۔ مجھے عطاء الحق قاسمی سے اگر گلہ ہے تو صرف اس بات کا کہ انہوں نے ایک بار بھی میرے ٹیلنٹ کی براہ راست حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میرے لکھے ہوئے جس کالم کو عطا نے نظر انداز کرنے کی بلنڈر کی اس کالم کا عنوان: ''گواسکر کی سینچری اور ہماری دُعائیں'' تھا۔ یہ کالم میں نے 1987 میں لکھ کر دیا تھا جب انڈیا اور پاکستان مشترکہ طور پر کرکٹ ورلڈ کپ کروا رہے تھے۔ عطاء الحق قاسمی کو کرکٹ کی سمجھ ہی نہیں تھی اور دعویٰ نواز شریف سے دوستی کا تھا جنگی کرکٹ سے دلچسپی پوری گوالمنڈی تسلیم کرتی ہے۔ لارنس گارڈن میں اُن کے چوکے نہ روکنے کا انعام بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ کرکٹ میں جُوا ابھی امکان سے باہر تھا۔ سُنیل گواسکر نے اُس وقت تک ون ڈے میں کوئی سینچری نہیں بنائی تھی۔ میں نے اپنے کالم میں گواسکر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مخالف ٹیم کے باؤلرز کے ساتھ مک مکا کرلے اور سینچری بنا ڈالے۔ اگر یہ کالم گواسکر کی نیوزی لینڈ کے خلاف سینچری سے پہلے لگ جاتا تو کمال ہو جاتا کیونکہ میں نے عطا کو یہ کالم ورلڈ کپ کے آغاز ہی میں لکھ کر دے دیا تھا۔ غالباً یہ گواسکر اور میرے حق میں بہتر ہی ہوا۔ گواسکر تو اکلوتی سینچری مار کر ریٹائر ہو گیا جبکہ میں کالم جیسی سہل پسندی اور صحافت سے نکل کر ادب کی طرف چلا گیا۔ میرے بعد حسن عباسی کا ٹیلنٹ جس طرح عطاء الحق قاسمی پر قربان ہوا وہ باعث عبرت ہے ہر اُس

مُضا فاتی کے لیے جو لاہور فتح کرنے کا عزم لے کر تو آتا ہے مگر یہاں آکر چڑھ جاتا ہے عباس تابش جیسے امریش پوری کے ہتھے، جو قابو آنے والے ہر شاعر یا شاعرہ کو سب سے پہلے تو عزت سے محروم کرتا ہے اور پھر اُسے بے غیرت بن کر پوری دنیا فتح کرنے پر لگا دیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے پہلے پہل کپورتھلہ ہاؤس میں دیسی ککڑ ا ابرار سحر سے خوب دلّہ گیری کروائی اور ریسی گھوڑے کی طرح اُس کا نام تک بدل کر ابرار ندیم رکھا۔ پھر اُسے ریڈیو میں بھرتی کروا کر غلامی سے آزاد کر دیا کیونکہ اُس کی جگہ عُزیر احمد (حافظ جوس کارنر، گڑھی شاہو، لاہور) لے چکا تھا۔ عُزیر احمد، عطاء الحق قاسمی کی دُھر ثابت ہُوا۔ اپنی جوس والی دکان کا سارا منافع کسی رنڈی کی طرح عطاء الحق قاسمی پر لٹانے لگا۔

زمانہ تو اب GIVE AND TAKE کا ہی چل رہا ہے۔ عُزیر احمد نے اپنے مولوی بھائی کے ادارے شفیق بک ڈپو سے عطاء الحق قاسمی کی کتاب: ''مزید گنجے فرشتے'' شائع کروائی اور عطاء الحق قاسمی کو اُس سستے زمانے میں ایک لاکھ روپے کی رائیلٹی بھی دلوائی۔ عطاء الحق قاسمی نے ''ڈبل شاہ'' کی طرح رقم ڈبل کر کے دونوں بھائیوں کو ایسے واپس کی کہ انہیں اپنی سفارت کے دوران مشاعرے میں ہوائی ٹکٹ اور اخراجات دے کر ناروے بلوایا جبکہ اعتبار ساجد جیسا شاعر جو شفیق بک ڈپو ہی سے چھپا تھا۔ ناروے کے مشاعرے کے لیے روتا سسکتا رہ گیا۔

وہ دن اور آج کا دن عُزیر احمد اپنی بیوی کے ساتھ اتنا وقت نہیں گذارتا جتنا عطاء الحق قاسمی کے ساتھ گذارتا ہے۔ اب تو وہ عطاء الحق قاسمی کا پٹی باندھ بھائی بھی بن چکا ہے، ''جوسیلا بھائی'' تو وہ پہلے ہی تھا۔ عطاء الحق قاسمی کے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی انہی نام نہاد بھائیوں کی گھٹیا حرکات اور اُن پر ہونے والی نوازشات کے باعث پردہ فرما گئے تھے ورنہ کمینگی میں کراچی کی حد تک اُن کا بھی کوئی ثانی نہیں تھا۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اپنے ایک شاعر دوست کے والد کے قلوں میں گئے تو کھجور کی گٹھلیوں پر کلمہ طیبہ پڑھنے میں مصروف حاضرین میں اپنا رسالہ ''ظرافت'' بانٹ دیا۔ اس حرکت پر جو ردِّ عمل ہوا، اگر جسٹس افتخار چوہدری کے علم میں آجاتا تو وہ بھی سوموٹو ایکشن لینے پر مجبور پائے جاتے۔ ضیاء الحق قاسمی اپنی پیدائش کے ساتھ ہی نحوست لے کر آئے تھے۔ اُن کی پیدائش کوئٹہ میں زلزلے والی رات کو ہوئی تھی جس کے جھٹکے جالندھر سے امرتسر تک میں محسوس کیے گئے تھے۔

عطاء الحق قاسمی، کمر کی مستقل تکلیف کے باعث اب ایک حد سے زیادہ نہ تو جھک سکتے ہیں نہ ہی کوئی ڈھنگ کا کام کر سکتے ہیں اس لیے عُزیر احمد کی ذمہ داریاں مزید بڑھ چکی ہیں۔ اب عطاء الحق قاسمی کے زیر جامے بوقتِ ضرورت اُتارنا اور چڑھانا بھی اُس کی ذمہ داری بن چکی ہے اور کبھی کبھار تو پیمپر تک اُسے ہی تبدیل کرنے پڑتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کی قومی خدمات کے صلے میں اکادمی ادبیات پاکستان، لاہور کے ڈائریکٹر قاضی جاوید نے عطاء الحق قاسمی کو کئی بار یہ پیشکش کی کہ وہ اپنے دفتر کے کلرک جمیل کو اُن کی ملازمت میں DEPUTATION پر بھجوا دیتے ہیں پیمپر چڑھانے اُتارنے میں جمیل کا جواب نہیں مگر عطاء الحق قاسمی نے جمیل کو عُزیر احمد پر ترجیح دینے سے صاف انکار کر دیا جس پر جمیل اپنا پیمپر سا مونہہ لے کر رہ گیا۔ عطاء الحق قاسمی نے جمیل پر واضح کر دیا کہ وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد کی لیکچرر ماہین ملک کا پرس معہ پاسپورٹ اور پاؤنڈز غائب کر دینے والا کارنامہ عُزیر احمد جیسا ڈفر گجر ہی سرانجام دے سکتا ہے، یہ کسی ریٹائرمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سرکاری ملازم کے بس کا کام نہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنی بزدلی اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے جو ڈرائیور رکھا ہے اُس کا نام ''بہادر'' ہے۔ گاڑی CNG پر چلتی ہے اور خود ڈرائیور پان پر چلتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی نیم جنسی فتوحات میں عُزیر احمد کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا حسن عباسی کا۔ شیخ زید بن سلطان النہیان (فاتح رحیم یار خان) کو پھڑکتی بوٹیوں کی فراہمی ملتان روڈ، لاہور پر واقع نگار خانوں سے ہوتی تھی اور عطاء الحق قاسمی کے لیے پٹولوں کی کھیپ حافظ جوس کارنر سے فراہم کی جاتی ہے۔ حافظ جوس کارنر وہ ڈیم ہے، جہاں سے عطاء الحق قاسمی کی جنسی فصل کی آبیاری کی جاتی

ہے۔ بیرون ملک جا کر عطا بارانی ہو جاتا ہے۔

دنیا کا کامیاب ترین فرد بھی ہر میدان میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ عطاء الحق قاسمی کے ساتھ بھی ہے۔ جسے بازاری ہانڈیوں کی چاٹ لگ چکی ہو وہ ازدواجی زندگی کے پھیکے پن کی شکایت لازمی کرے گا۔ عطاء وہ جنسی تالہ ہے جو کسی بھی زنگ آلود چابی سے کھل سکتا ہے۔ عطاء اپنے گھر ہی میں دوستوں کی بے تکلف محفل کے دوران ترنگ میں آکر اپنی زوجہ محترمہ کو ''ٹھنڈا گوشت'' کا خطاب دے بیٹھا۔ خاندانِ قاسمیہ کے ولی عہد یاسر پیرزادہ نے یہ بات سُن بھی لی اور بھرپور نفرت کے ساتھ اپنے ذہن میں بٹھا بھی لی۔ ایک خاوند تو اپنی دماغی آٹھویں ترمیم کے تحت بیوی کو ایسا کہہ سکتا ہے مگر کوئی بیٹا اپنی ماں کے متعلق ایسا سننا کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی سبب ہے باپ بیٹے کے درمیان مستقل سرد جنگ کا۔ عطاء الحق قاسمی نے بیٹے کی برین واشنگ کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اب اپنے باپ سے ایک خاص فاصلہ رکھے ہوئے ہے۔ تمام پاکستانی کالم نگار اگر کسی چیز کے ہاتھوں مجبور ہیں تو وہ شاعری اور شراب ہے۔ ہر بڑا پاکستانی کالم نگار کبھی بھی اپنا کالم سنانے کا کہہ کر بیرون ملک کا ویزا نہیں لیتا بلکہ مشاعرے کی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔

اقبال ساجد سے شاعری خریدنے والوں میں سرفہرست تو حسن رضوی تھے دوسرا نمبر عطاء الحق قاسمی کا تھا۔ اقبال ساجد والا سٹاک ختم ہوا تو امجد اسلام امجد کو دوستی کا واسطہ دے کر چونا لگایا۔ بہت سی غزلوں کا DONATION عباس تابش نے بھی دیا اور پھر صحراؤں سے حسن عباسی کی صورت میں عطاء الحق قاسمی کا شعری مسیحا نمودار ہوا۔ ''تُو میرا سہارا ہے میں تیرا سہارا ہوں'' کے اصول کو اپناتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول گئے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ بڑی مچھلی ہی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی ہر لحاظ سے زیادہ فائدے میں رہا مگر حسن عباسی کے لیے اس دیگ کی کھُرچن ہی کافی تھی۔

جس طرح موساد اور را آپس میں معلومات کا تبادلہ کرتی ہیں اسی طرح عطاء الحق قاسمی اور عباس تابش نے بھی آپس میں حسن عباسی کے حوالے سے معلومات کا تبادلہ کیا اور نتیجے میں اُسے خوب ورتا۔ دنیا روزِ ازل سے ایسے ہی چل رہی ہے۔ شکار کر کے کھانے والے بھی ہیں اور مردار خور بھی۔ بلکہ مردار خور شکار کر کے کھانے والوں سے بھی کہیں زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ کیا کسی شخصیت کی عظمت اُس کی طویل عمری میں پوشیدہ ہے؟ اس سوال کا جواب میرے نزدیک تونفی میں ہے کیونکہ سعادت حسن منٹو نے صرف 43 سال کی عمر پائی مگر اُن کے ہم عصر احمد ندیم قاسمی، منٹو سے دگنی عمر پا کر بھی منٹو سے بڑے نہ بن پائے۔ عطاء الحق قاسمی کا نام کالم نگاری میں تو کبھی کا بن چکا ہے مگر شاعری جیسے آپشنل مضمون میں وہ مسلسل فیل ہو رہے ہیں جو پورے خاندانِ قاسمیہ اور ''حلقۂ عطائیہ'' کے لیے مستقل دردِ سر ہے۔ اُن کی ست رنگی شاعری کئی ذہنوں کی پیداوار ہے۔ وہ خود اپنے 20 شعر سنانے والی شرط کئی مرتبہ ہار چکے ہیں۔

عطاء، اپنے حلقۂ احباب میں کام کرنے اور کام لانے کے سلسلے میں بہت مشہور ہیں۔ مجلس ترقی ادب کی وہ نشست جو شہزاد احمد ''سانوں نہر والے پل تے بلا کے''فیم کی دوبارہ وفات سے خالی ہوئی تھی، عطاء الحق قاسمی کی صوابدید پر تھی۔ اس سیٹ پر الفی لگا کر بٹھانے کے لیے عطاء نے جن بزرگوں کو جھانسہ دیا اُن میں سرفہرست تو ڈاکٹر خورشید رضوی تھے۔ زیرِ غور لسٹ کی طوالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے دوسرے سرے پر خالد اقبال یاسر (سابقہ ڈی۔ جی۔ اُردو سائنس بورڈ) بھی اپنے پورے تجربے اور احترام کے ساتھ موجود تھے مگر یہ احترام بک ہوم والا احترام ثابت ہوا۔ اگر ہم ''بخشی رُوح'' کا نام لیں تو وہ مونہہ متھے لگنے والی گجراتن ڈاکٹر صغریٰ صدف تھی جسے عطاء الحق قاسمی نے PILAC میں ڈاکٹر عباس نجمی کی جگہ لگوایا اور وہ احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو کر آج بھی عطاء کو چومتی چاٹتی ہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ڈاکٹر عباس نجمی جو کشتیاں جلا کر اور گشتیاں بھگا کر PILAC میں آیا تھا ایک عورت کے ہاتھوں شکست برداشت نہ کرتے ہوئے زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔

یوں تو عطاءالحق قاسمی کے تھکے ماندے شعر وزیرآباد سے لاہور تک کا فاصلہ بمشکل طے کرپاتے ہیں مگر صغریٰ صدف کے حوالے سے اُن کا یہ شعر گجرات کی حدود کے علاوہ سکھوں کے ذریعے سرحد پار بھی گیا:

پورے گجرات کا بس ایک ہدف

صغریٰ صدف! صغریٰ صدف!

عطاءالحق قاسمی کے لاہور آرٹس کونسل سنبھال لینے سے، جس کی داغ بیل فیض احمد فیض جیسی عظیم شخصیت نے ڈالی تھی، ادیبوں اور فنکاروں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا LAHORE ZOO والوں کو پہنچا ہے۔ جب بھی افریقی دریائی گھوڑا پاکستانی حالات سے اُکتا کر اپنے لیے مختص تالاب کی تہہ میں آرام فرما رہا ہوتا ہے اور بچے اُسے دیکھنے پر بضد ہوتے ہیں تو چڑیا گھر والے ایسے ضدی بچوں کو سڑک پار آرٹس کونسل کی طرف DIVERT کر دیتے ہیں۔ بچے بھی نایاب نسل کا کشمیری دریائی گھوڑا دیکھ کر خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور اُس پر سکے نچھاور کرنے لگتے ہیں۔ رہی سہی کسر ''بزبانِ قاسمی'' لطیفے سن کر یا CD دیکھ کر پوری ہو جاتی ہے۔ سبق آمیز کہانیاں قوم کو سنانے کا ٹھیکہ تو اشفاق احمد کے پاس تھا اس لیے عطاء نے اشفاق احمد کے چھابے پر چھاپہ نہیں مارا کہانیوں والی فصلیں اُجاڑنے سے ''بوجوہ'' گریز کیا۔

عطاءالحق قاسمی کے PTCL نمبر 04237521122 پر چلتی ٹیپ: ''میں عطاءالحق قاسمی بول رہا ہوں، میں گھر پر نہیں ہوں۔ اگر تم ڈاکٹر فوزیہ چوہدری یا ڈاکٹر صغریٰ صدف کال کر رہی ہو تو میں گھر پر اکیلا ہوں۔''

عطاءالحق قاسمی نے ایک تقریب کے دوران شہباز شریف کے کان میں یہ بتا کر چونکانے کی کوشش کی: ''میاں صاحب میں نے اپنی ناک سے F-16 طیارہ کھینچنے میں مکمل مہارت حاصل کر لی ہے۔ یوتھ گیمز میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں'' میاں شہباز شریف نے چونکے بغیر بڑے مدبرانہ انداز میں عطاءالحق قاسمی کو سرگوشی میں جواب دیا: ''قاسمی صاحب! پلیز ایسی حرکت نہ کریں۔ آپ کی ناک جائے گی اور ہماری حکومت''۔

شریف خاندان سے عطا کی وفاداری کا یہ عالم ہے کہ اپنا گردہ بھی نکلوایا تو شریف میڈیکل کمپلیکس، رائے ونڈ جا کر، ورنہ اس تاریخی صحافتی گردے کا عالمی مارکیٹ میں کہیں زیادہ ریٹ لگ رہا تھا لیکن یہ ایثار و قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ نواز نے میں تو نواز شریف کا کوئی ثانی نہیں۔ عطاءالحق قاسمی عرصہ دراز سے زیرِ غور گورنر ہیں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو کوئی دوسرا کن ٹٹا گجراتیا یا پاکستانی نژاد ولایتی انڈا فروش اُن سے ہرگز نہیں چھین سکتا مگر اُن کے سطحی اور مفاداتی قسم کے جلد باز دوست جب اُن کی توجہ گورنر ہاؤس کا قبضہ لینے کی طرف دلاتے ہیں اور گورنر ہاؤس کی طرف رُخ کر کے فحش اشارے کرتے ہیں تو عطا کے 3-D چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے اور انہیں ''سُرخا'' کہنے کو جی چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ یاد رہے گورنر ہاؤس قبلہ رُخ بنایا گیا ہے اُس کا احترام اسلامی اور قاسمی دونوں لحاظ سے جائز ہے۔

قارئین ابھی تک عُزیر احمد کی اہمیت عطا کی زندگی میں سمجھنے سے قاصر رہے ہیں تو عرض ہے کہ عطاء کی زندگی میں عُزیر ایسا ہی ہے جیسا آصف علی زرداری کی زندگی میں ٹپی۔ عُزیر احمد تو ٹپی سے بھی کہیں بڑھ کر عطا کا پپی ہے۔ پاکستان میں عطاءالحق قاسمی کی جنسی خدمات والا TOPIC منظور نہ ہو سکا اور ڈاکٹر فوزیہ چوہدری (فخرِ فورٹ عباس) ڈاکٹر صغریٰ صدف (فخرِ گجرات) عطا کو جاننے، ماننے، ماپنے اور چاہنے کے باوجود اس حوالے سے کچھ نہ لکھ سکیں مگر ناروے اور تھائی لینڈ جیسے SEX FREE ممالک میں (جہاں عطاء فرمائش کر کے سفیر بنے تا کہ اُن کی اُردو ہی سے کام چل جائے اور انگلش نہ بولنی پڑے) اُن کے جنسی کارناموں کی چلتی پھرتی کئی اعزازی ڈگریاں ٹکے ٹوکری ہو رہی ہیں لیکن جمشید مسرور کی زوجہ والا زنانے دار تھپڑ ان تمام ڈگریوں کا نشہ ہرن کر دیتا ہے۔ اپنے ہر معقول ملاقاتی سے اکثر یہی سوال پوچھتے پائے

جاتے ہیں کہ پاکستان کا کوئی اعلیٰ ترین ایوارڈ بچا ہوتو بتاؤ میں اُسے لے کر بتاتا ہوں۔ اگر کوئی ''نشان حیدر'' کا نام لےتو سخت خفا ہوتے ہیں۔ سوال کی نامعقولیت کا اندازہ ہوتے ہی معقول کو نامعقول بنتے زیادہ دیر نہیں لگتی اور اکثر اس سوال کے بعد ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوتی ہے۔ پینٹئیم ڈیڑھ دماغ کی وجہ سے اگر خود سے سوال کرتے ہیں کہ جانے والا آخر لوٹ کر کیوں نہیں آیا، پھر ناک کے زور پر بے ہودہ انداز میں گانے لگتے ہیں:

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

اُن کا مینوفیکچرنگ فالٹ اصل میں اُن کے کشمیری ہونے میں ہے جو شلجم جیسی سویٹ ڈش کا سالن بنا کر کھاتے ہیں۔ بچپن میں انہیں ''شہزادہ'' کے نام سے کم اور ''گونگلو پکاسو'' (GONGLOO PICASSO) کے نام سے زیادہ پکارا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں شلجم اُن کی کمزوری ہوا کرتا تھا۔ اپنے گھر میں پکے ہوئے گونگلو اُن کی طبیعت نہ بھر پاتے تو ہمسائیوں کی دیگچیاں خالی کر جاتے اور اُسے خوش خوراکی کا نام دیتے۔ اُن دنوں اُن کی جیبوں اور بستر تک میں سے شلجم عرف گونگلو برآمد ہوا کرتے تھے۔ وزیر آباد کے جن پرانے دوستوں کو وہ عزیز احمد اور حسن عباسی کی خاطر چھوڑ چکے ہیں وہ اب مذکورہ دونوں شاعروں کو دھوتیاں اُٹھا اُٹھا کر بددعائیں دیتے ہیں۔ اقبال جوئیہ آف گکھڑ منڈی ایسے مشتعل دوستوں کو ٹھنڈا ٹھار شہتوت جلیبا بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر ناراض گروپ علی اکبر ناطق کی سربراہی میں پوری طرح متحد ہے اور اسلام آباد میں عطا شکن میزائیلوں کی تیاری زوروں پر ہے۔

عطا کی تخلیقی صلاحیتوں سے کون نارڑ انکار کرسکتا ہے؟ اُن کی تخلیقی مشقت کا مونہہ چھپاتا ثبوت کئی سفرناموں کے وہ ABORTION ہیں جو دشمنوں کے جلاپے میں جُلاب لے کر لکھے گئے البتہ حسن عباسی کی تصنیف: ''رموزِ دلّہ گیری'' کا جو ابتدائیہ قاسمی نے لکھا ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور پڑھنے سے زیادہ عمل کرنے سے تعلق رکھتا ہے اور کسی بھی دلّال کا منشور قرار پاسکتا ہے۔

نواز شریف کسی پر گنجا اعتماد تو کر سکتے ہیں مگر اندھا اعتماد نہیں کر سکتے۔ جنرل مشرف نے انہیں یہی سکھایا ہے۔ حجاج بن یوسف نے تو ایک بیٹی کی پکار پر خود آنے کی بجائے اپنے جرنیل محمد بن قاسم کو بھیج دیا تھا مگر میاں نواز شریف نے ڈاکٹر سعادت سعید کی مخبری پر G.C. یونیورسٹی کی ایک اسسٹنٹ پروفیسر صائمہ ارم کی بازیابی کے لیے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ معاملہ صوبائی سطح پر برادرِ خورد میاں شہباز شریف کے سپرد کرنے کی بجائے ازخود چھاپہ مارنے کا دلیرانہ فیصلہ اسلامی روایات کے عین مطابق کیا۔ انہوں نے گلیمر ہائٹس، وارث روڈ، لاہور، جو کہ عطاء الحق قاسمی کا آرٹس کونسل کے بعد دوسرا بڑا اڈا ہے (تیسرا ٹھکانہ اصغر ندیم سیّد کا گھر ہے) پر خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتے ہوئے وگ بدل کر چھاپہ مارا۔ عطاء الحق قاسمی کی ذہانت اور اثر ورسوخ دیکھیں کہ اُس نے اِس چھاپے کو بھی میڈیا میں ''دوستانہ ملاقات'' قرار دلوادیا۔ عطاء الحق قاسمی تیری شاطرانہ ذہانت کو سلام!

بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس کتاب میں شامل یہ واحد مضمون ہے جس میں میرا حصہ برائے نام ہے۔ یہ مضمون کتاب میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اس میں بھی شخصی حوالے سے دلچسپ معلومات اور ادبی چاشنی موجود ہے ''میر تقی میرؔ'' کا خاکہ خشونت سنگھ نے لکھا ہے جو اُن کے ناول: ''دِلّی'' میں شامل ہے جسے میں نے 1998 میں ترجمہ کیا تھا۔ جبکہ ''انوریؔ'' کا قصہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے قریب قریب ایک صدی قبل لکھا تھا۔ میں نے ان دونوں کو یکجا کر کے اُن قارئین کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے جو نثر کے ساتھ ساتھ شاعری بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس ''خاکے'' کو ''ماخوذ'' تصور کیا جائے اور میری پسند سمجھا جائے۔ ان دونوں شخصیات نے خود کو کیسے منوایا یہی پڑھنے، سیکھنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جینوئین رائٹرز اور شاعروں کی راہ روکنے والے آج پہلے سے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں انسان کی حرص اور کمینگی کہاں ختم ہوئی ہے؟ ناصرف اس مضمون بلکہ پوری کتاب میں آپ کو بڑے انسانوں کی چھوٹی حرکات اور خصلتیں جا بجا بکھری نظر آئیں گی جن سے اُن کے دشمن تو تنگ ہیں ہی، دوستوں اور گھر والوں کی نفرت اور بیزاری کا عالم بھی کچھ کم نہیں۔ بظاہر ان پرانے قصوں میں آپ کو آج کے جیتے جاگتے کئی کردار صاف دکھائی دیں گے۔ ابوالفضل کی جگہ آپ کو قاسمی نظر آئے گا اور شہنشاہ اکبر کی جگہ نواز شریف جس نے بادشاہت کی آٹھ سالہ ٹریننگ سعودیہ سے اور ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری G.C یونیورسٹی سے لی ہے۔

چچا امان اللہ نے مجھے فارسی اور اُردو پڑھائی، اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کیا۔ میں اس تھوڑے سے علم کو، اُمراء کے بچوں کو پڑھانے کے لیے استعمال میں لاتا۔ بیچ میں کچھ شامیں، میں مشاعروں میں گزارتا، اور دہلی اور آگرہ کے معروف شعراء کا کلام سنتا۔ اُن میں سے بیشتر عام سے شاعر تھے، جن کے ہاں کوئی نیا خیال نہ تھا۔ اس قسم کے شعراء بالخصوص مسعود نامی ایک گیت نگار نے جو مشاعروں کا پسندیدہ تھا، میری نفرت کو ہوا دی۔ مسعود ایک خوبصورت مگر خرانٹ شخص تھا، جو اپنی مکروہ شاعری کو اپنی سریلی آواز میں گا کر مشاعرہ لوٹ لیتا تھا۔ جونہی مشاعرے کا آغاز ہوتا اُس کے شیدائی ''پروانہ، پروانہ'' (اُس کا تخلص) کا شور مچانا شروع کر دیتے (میں نے ہمیشہ ہی اُسے ''پتنگا'' کہا جو پروانے کا تحقیر آمیز نام ہے) عورتیں اُس کی دیوانی تھیں۔ ہر مشاعرے پر میں دیکھتا کہ پردے کے عقب میں بیٹھی ہوئی خواتین خادماؤں کے ہاتھ اپنے رقعے بھیجتی تھیں جن میں ''پروانے'' کی شاعری سنانے کی درخواست ہوتی۔ عام طور پر یہ شاعری پروانے کی شمع سے محبت کے بارے میں ہوتی، جس کی لو پر وہ جل مرنے کی آرزو رکھتا۔ مجھے حیرت تھی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانے جتنا قدیم خیال کس طرح لوگوں کے جذبات کو اُبھار سکتا ہے! پروانہ کے بارے میں جس چیز نے مجھے سخت اُلجھن میں مبتلا کیا۔ وہ یہ تھی کہ اپنے پست اور ادنیٰ خیال کے باوجود وہ نیا پن اور تنوع پیدا کرنے سے قاصر رہا تھا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ یہ اس بے وقعت پتنگے سے حسد ہی کہ باعث تھا کہ میں سخن طرازی کی کوشش کرنے پر مجبور ہو گیا۔

گھر کے دیگر افراد جب سو رہے ہوتے تو میں تیل کے چراغ کی روشنی میں شعر لکھتا۔ مجھ پر شعروں کا نزول اس طرح ہوتا جیسے آبشار کا پانی۔ اگرچہ میں اس قدر شرمیلا واقع ہوا تھا کہ اپنے شعر سر عام پڑھنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا، پھر بھی میں نے اپنا کلام چند

ایک ایسے شعراء کو دکھایا، جو میرے خیال میں اوسط درجے سے اوپر تھے۔ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی کم سنی میں بھی میرے ہاں الفاظ کی اَز حد فراوانی ہے۔ کچھ نے اس شبے کا اظہار کیا کہ میں نے کسی اور کا کلام چرایا ہے: ''اگر یہ شعر واقعی تمہارے ہیں تو پروانہ کا باب بہت جلد ختم ہونے والا ہے'' ایک شاعر نے تبصرہ کیا۔ ایک اور شاعر بولا: ''اسے شمع کے اوپر جلنا پڑے گا'' میں نے قدرے برہمی سے کہا: ''آپ اس پتنگے کو شاعر کہتے ہیں؟ وہ زنخوں کی سی آواز والا محض ایک تک باز ہے'' یہ بات زبانِ زد و عام ہوگئی کہ بارہ برس کے ایک چھوکرے نے آگرہ کی محفلوں کے چراغ کے متعلق توہین آمیز الفاظ کہنے کی جسارت کی ہے۔ جلد ہی پروانہ کو بھی اس بات کا علم ہو گیا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ''یہ تقی میر تقی کا بچہ کون ہے؟'' وہ دہاڑا۔ ''میں اُسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ زندگی بھر نہیں بھولے گا'' کچھ خانوادے جو پروانہ کے مداح تھے، انہوں نے مجھے نوکری سے جواب دے دیا۔ اس پر بھی پروانہ کی تسلی نہ ہوئی تو اُس نے مجھے برسرِ عام بے عزت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آگرہ کے امیر کبیر نواب رئیس میاں کی حویلی میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ رئیس میاں کی بیگم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ پروانہ کی بہت گرویدہ ہیں۔ کسی نے پروانہ کے کان میں سرگوشی کی کہ میں بھی مجمع میں موجود ہوں۔ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ پروانہ کی نگاہیں مجمعے کا جائزہ لے رہی ہیں، جبکہ مخبر آنکھوں سے برابر میری طرف اشارے کر رہا تھا۔ پروانہ نے بھی مجھے دیکھ لیا، اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اتنی بلند آواز میں بولا کہ سارا مجمع بخوبی سُن لے: ''اب تماشا دیکھنا!'' جونہی ایک شاعر نے اپنا کلام ختم کیا، پروانہ کے چیلوں نے چلانا شروع کر دیا: ''پروانہ صاحب'' ''پروانہ صاحب'' پروانہ نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے سیاسی اور نمائشی انداز میں لوگوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا: ''حاضرین محترم! اس ناچیز کی تحسین پر بندہ آپ کا بہت ممنون ہے۔ میں آپ کا غلام ہوں، اور آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت آمادہ! لیکن آج شام اس سے پہلے کہ آپ کا یہ خادم اپنا منہ کھولے، میں ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے ستارے کے اعزاز میں سب سے خاموش ہونے کی درخواست کروں گا۔ پروانہ اُس کے سامنے محض ایک پتنگا ہے۔ اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں کہ آپ نے اُس کا نام نہیں سنا، کیونکہ دنیا ابھی تک اُس کے کلام سے ناآشنا ہے۔ اُس کے ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں نکلے، لیکن وہ خود کو اُستادوں کا اُستاد کہتا ہے'' اُس کی آواز طنز سے بھرپور اور جذبات سے تھرتھرا رہی تھی۔ اُس کے چیلے خوشی سے ''ٹھی ٹھی'' کرنے لگے۔ وہ اپنے ایک چیلے کی جانب مڑا اور پوچھا: ''تم نے کیا نام بتایا تھا اُس لونڈے کا؟ آہاں، میر۔ پورا نام میر تقی میر! شمع اس ذی شان کے سامنے رکھ دی جائے''

میں ششدر رہ گیا۔ میں نے آج تک کسی محفل میں اپنی زبان نہیں کھولی تھی، اور نہ ہی اپنا کوئی کلام ساتھ لے کر آیا تھا۔ شمع میرے سامنے رکھ دی گئی۔ سینکڑوں آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے ماتھے پر پسینہ بہہ نکلا، اور ہاتھ کپکپانے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے والدِ محترم کا تصور کیا۔ میں نے دُعا کی: ''یا اللہ! تم ہی میرے حامی اور مددگار ہو'' مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا کہوں، سوائے ایک بند کے، جو میں نے شمع و پروانہ کے خیال پر سوچا تھا۔ فقط یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس خیال کو ذرا مختلف انداز سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے، نہ کہ اس پتنگے کی طرح جس نے مجھے بے عزت کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں نے اپنی آواز میں ہر ممکن حد تک نفرت سموتے ہوئے کہا: ''پروانہ صاحب! اس سے پہلے کہ میں اپنا کلام سناؤں، میں ایک حقیر سا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش

کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ درخواست ہے کہ اسے قبول فرمائیے!'' پھر میں نے صاف اور کھنکھناتی آواز میں پڑھا:

کچھ نہ دیکھا پھر بجز ایک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

اُن میں سے کسی نے محبت کا یہ پہلو نہیں دیکھا تھا۔ محبت جسے اپنے محبوب کے لیے خاک ہونے کے سوا کوئی آرزو نہیں۔ جیسے ہی حاضرین نے میرے الفاظ کی تفہیم کی، مجمع ''مرحبا! سبحان اللہ، کیا خوبصورت کہا!'' کے شور سے گونج اُٹھا۔ اس دادو تحسین سے حوصلہ پا کر میں نے محبت کے بارے میں ایک نظم پڑھنے کی اجازت چاہی، جو میں نے گزشتہ رات لکھی تھی اور میرے ذہن میں ابھی تک تازہ تھی:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں
عشق معشوق عشق عاشق ہے
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
یعنی اپنا ہی مُبتلا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق، مُدعا ہے عشق

حاضرین میرے کلام سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ ہر شعر پر ''واہ، واہ، واہ، مکرر'' کا شور اُٹھا۔ میں نے بار بار پڑھا۔ کئی لوگ اُٹھ کر آئے اور انہوں نے مجھ پر چاندی کے روپے نچھاور کیے۔

یارو مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں
اک ایک فرط دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جامِ شراب پُر نہ کرو، میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو، میں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں
معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو، میں نشے میں ہوں

بھاگی نماز جمعہ تو جاتی نہیں ہے کچھ
چلتا ہوں میں بھی ٹک تو رہو، میں نشے میں ہوں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
ہوں شیشہ میرے منہ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

ایک خادمہ نے مجھے طلائی اشرفی دی، جس کے ساتھ اس پیغام کا ایک رقعہ بھی تھا کہ میں اپنے اس کلام کی نقل اپنے ہاتھ سے تیار کر کے اگلی صبح ذاتی طور پر حویلی پہنچادوں۔ یہ رقعہ گھر کی مالکن کی طرف سے تھا۔ بطور شاعر اور عاشق یہ میرا آغاز تھا۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ مشاعرے میں ملنے والی داد وتحسین کا شور میرے کانوں میں گونجتا تھا۔ میں نے اس بہروپیے پروانہ کو نیچا دکھایا تھا، اور اب وہ ایسی کسی محفل میں اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا، جہاں کہ میں موجود ہوتا۔ لیکن یہ عورت کون تھی، جس نے مجھ سے میرے کلام کی فرمائش کی تھی؟ میرا سر گھوم رہا تھا۔ بے خواب رات گزارنے کے باوجود صبح میں نے خود کو فتح یاب، اور تازہ دم محسوس کیا۔ میں نے مشاعرے میں ہونے والا واقعہ اپنی ماں کو سنایا، اور طلائی اشرفی، اور چاندی کے وہ روپے اُسے دیئے جو مجھ پر نچھاور کیے گئے تھے۔ ''یہ سب تمہارے ابا کا فیض ہے'' ماں نے کہا: ''وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ تمہیں ہندوستان کا معروف ترین شاعر بنتے دیکھیں گے''

ابوالفضل اور فیضی اور راجہ بیربل کے سے لائق اور دانا لوگوں نے زور بیان اور زور قلم سے شہنشاہ اکبر کے دل پر ایسا سکہ جما رکھا تھا کہ کسی دوسرے کی دربار شاہی میں دال نہ گلتی تھی۔ شاعر دربار شاہی میں آتے تھے اور عموماً ناکام و نامراد ہی واپس جاتے تھے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ کوئی شاعر آیا اور اُس نے بادشاہ کو قصیدہ سنایا اور اس دوران میں ابوالفضل یا فیضی نے قصیدے کا بیشتر حصہ ذہن میں ایسے رکھ لیا کہ بعد قصیدہ ختم ہونے کے بادشاہ کو پڑھ کر دوبارہ سنا دیا اور کہا یہ قصیدہ تو میں نے کہا تھا بلکہ ثبوت میں مقطع بھی فی البدیہ کہہ کر پیش کر دیتے تھے۔ غرض جو شاعر آتا اس کو یہ دونوں بھائی یعنی ابوالفضل اور فیضی دوسرے درباریوں کی امداد سے تختۂ مشق بنا کر چھوڑتے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی شاعر اگر پیر جمانے بھی لگتا تو اُس کی ہوا خیزی ہو جاتی۔

ابوالفضل کی خداداد ذہانت اور قابلیت نے اُس کو بیک وقت ہندوستان کا ملک الشعراء اور فردوسی وسعدی بنا دیا تھا۔ وہ شاعر تھا، ناصح تھا، فلاسفر تھا اور ساتھ ہی درباری رسوخ کی کنجی بھی تھا۔ گویا ایک طرف قابلیت تو دوسری طرف رسوخ یعنی آج کل کی اصطلاح میں محکمہ تعلیم اور پراپیگنڈا دونوں اس کے ہاتھ میں تھے۔ اُس کی ٹکر کے شاعر اور بھی تھے مگر بھلا انہیں کون پوچھتا تھا۔ قصہ مختصر ابوالفضل اصلی معنی میں ابوالفضل ہو رہا تھا۔ اُس کا مدمقابل شعر وشاعری میں کوئی نہ تھا اگر کوئی مقابلے کی نیت سے اُٹھا تو اُس نے منہ کی کھائی۔ درباری رسوخ تو بڑی چیز ہے، قصیدہ پیش ہونے کی نوبت نہ آتی اور اگر نوبت آتی تو بسا اوقات پشیمانی بجائے کامرانی کے نصیب ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ ابوالفضل کی قابلیت کا سکہ ہندوستان سے نکل کر کابل اور ایران تک جا پہنچا۔

اِدھر تو فارسی شاعری میں ابوالفضل کی شہرت زوروں پر تھی، اور اُدھر ایران میں انوریؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ اگر ابوالفضل کے اشعار ہندوستانی سرحد پار کر کے ایران میں پہنچ کر غلغلہ بلند کرتے تھے، تو اُدھر سے انوریؔ کا زور جواب میں پکار کر اہل ہندوستان

اوراہل فارس سے کہتا تھا کہ کجاعلی کا پسینہ اور کجا گلاب کی بو۔ کہاں اہل زبان انوریؔ اور کہاں بیچارہ ابوالفضل، نا گورعلاقہ مارواڑ کا رہنے والا۔ آگے چل کر پھر ٹھہرا مارواڑی!

بھلا انوریؔ کو ابوالفضل سے کیا نسبت!

غرض ایک طرف بُلبل شیریں مقال یعنی انوریؔ کے چہچہوں سے ایران و ہندوستان کی علمی فضا معمور تھی تو دوسری طرف ابوالفضل کی شاعری کا سکہ ہندوستان چھوڑ ایران تک میں چلتا تھا۔

اکبر کی علمی مجلسوں کے چرچے، اہل علم و باکمال لوگوں کی قدردانی کے چرچے، ہندوستان سے باہر پہنچ چکے تھے اور ہر باکمال ان دلچسپ علمی مناظروں اور مباحثوں کا احوال سن کر بے چین ہو جاتا تھا۔ روح تڑپ جاتی تھی کہ کیونکر اکبر کے دربار تک رسائی ہو۔ کمال موجود ہے مگر اُس کی قدر کرنے والے تک رسائی نہیں۔ کس طرح باکمال لوگ کشاں کشاں دربار اکبری کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے، جیسے کہ ایک مقناطیسی قوت ہے جو کھینچے لیتی ہے۔

انوریؔ صاحبِ کمال تھا۔ اس کو اپنے کمال پر ناز تھا اور بجاطور پر ناز تھا، وہ جانتا تھا کہ ابوالفضل اُس کی ٹکر کا آدمی ہے۔ اپنے دل میں وہ ابوالفضل کی طرف سے چشمک سی محسوس کرتا تھا بلکہ ایک ''علمی کشتی'' یا ایک ''ادبی ٹکر'' کے لیے اُس کے نوجوان اور شاعرانہ دل میں تمنا اُٹھتی تھی۔

اکبر کے دربار میں پہنچوں، ذرا ابوالفضل سے میدان شعر و شاعری میں مقابلہ ہو، تب ذرا لطف رہے۔ یہ خیالات انوریؔ کے تھے۔ اُس کو یہ معلوم تھا کہ خود شہنشاہ اکبر اُس کے کلام سے آشنا ہو چکا ہے۔ اُس کی شاعری اور اُس کے نام سے واقف ہے۔ خود اکبر جانتا ہے کہ میرے شاعر شیریں مقال یعنی ابوالفضل کا ایک ہم عصر ایران میں رہتا ہے اور اُس کا نام انوریؔ ہے۔ یہ تمام باتیں انوریؔ خود جانتا تھا۔

پھر علاوہ اس کے دربار ایران اور دربار اکبری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انوریؔ کی قدر ایران میں تھی اور ہو گی مگر کہاں اکبر بادشاہ اور کہاں شاہ ایران۔ بہت جلد انوریؔ کو معلوم ہو گیا کہ جیسے کوئی مقناطیس ہے جو آگرے کی طرف اُس کو کھینچ رہا ہے۔ ایک قوت ہے کہ اُس کو اپنی طرف مسلسل کھینچ رہی ہے۔ اُس نے دربار اکبری میں جانے کا ارادہ کیا تو اُس کو معلوم ہوا کہ افسوس وہاں کی علمی فضا بھی درباری سازشوں سے مکدر ہے۔ ابوالفضل عجب نہیں کہ انوریؔ کو وہاں گھسنے بھی نہ دے اور اگر کسی نہ کسی طرح وہ کامیاب ہو بھی جائے تو یہ نتیجہ نکلے کہ اکبر کو انوریؔ کے بارے میں کہنا پڑے کہ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

بڑے بڑے اہل علم و فضل اکبر کے دربار میں پہنچے۔ ہر صاحب کمال میں (آخر انسان ہی تو ہے) برائیاں بھی لازمی ہیں، لہٰذا دربار اکبری میں اگر اُس کی کمزوریاں اُس کے فضائل سے پہلے پیش ہو گئیں تو ظاہر ہے کہ سب علم و فضل دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور ایک دفعہ دربار میں سُبکی ہو گئی تو پھر دوبارہ اُدھر سے گزر بھی مشکل ہے۔

انوریؔ نے ان تمام امور پر غور کیا۔ اچھی طرح غور کیا۔ اُس کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اُس کے شعر پڑھ کر اکبر جھوم جاتا تھا۔ اب وہ دربارِ اکبری میں پہنچنا چاہتا تھا لیکن اگر کہیں وہاں اُس کی علمی قابلیت کا اظہار ہونے سے پہلے اُس کی کوئی کمزوری یا لغزش پیش ہوگئی یا بالفاظ دیگر پیش کرادی گئی تو کیا ہوگا؟ غرض ان تمام امور پر انوریؔ نے غور کیا اور پھر بھی خود کو دربارِ اکبری میں پہنچنے کے لیے اور ابوالفضل سے ایک ''علمی ٹکر'' لینے کے لیے ہمہ تن تیار پایا۔ اُس نے ٹھان لی کہ میں ہندوستان ضرور پہنچوں گا۔

انوریؔ نے ایران کب چھوڑا اور ہندوستان میں کب داخل ہوا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکا، نہ تو وہاں رائٹر ایجنسی تھی اور نہ کوئی نامہ نگار خصوصی تھا جو ابوالفضل یا خود بادشاہ کو اطلاع ہوتی کہ انوریؔ دربارِ اکبری کی طرف آرہا ہے۔ انوریؔ آگرے میں ایک پردیسی فقیر کی طرح داخل ہوا اور اُس نے اِدھر اُدھر کی خبریں لینا شروع کیں تو اُس کو معلوم ہوا کہ دربار تک اگر رسائی آسان ہے تو جمنا مشکل ہے۔ قصیدہ پیش کرنا کسی بھی شاعر کے لیے ایک خطرناک بات ہے۔ ابوالفضل کا حیرت انگیز حافظہ اور ذہانت کہیں اُس کو شکست نہ دے دے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اِدھر وہ قصیدہ سنا کر سلام کرکے بیٹھے اور اُدھر ابوالفضل کھڑا ہوکر عرض کرے کہ یہ قصیدہ میرا تھا اور فی البدیہہ اس زمین پر اور شعر کہہ کر پیش کردے کہ بقیہ شعر یہ اور موجود ہیں اور مقطع کا شعر یوں ہے، رہی سہی کسی فیضی سنا کر پوری کردے۔

ان تمام امور پر انوریؔ نے غور کرکے ایک نئی راہ نکالی۔ وہ ایک دیوانہ صورت گداگر بن گیا۔ اب یہ اُس کی قابلیت تھی کہ اس نے کسی نہ کسی طرح ''توکیستی؟'' کی چڑ بنالی۔ یعنی ''تو کون ہے؟'' اسے انگریزی میں "Who are you?" سمجھ لیں اور پنجابی میں ''نواں آئیاں اے سوہنیاں'' تصور کرلیں۔ کوئی اُس سے پوچھتا کہ ''تو کون ہے؟'' تو انوریؔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک دیوانے پن سے اُس کی جان کو آجاتا۔ سوال کرنے والے سے وہ خود سوال کرتا کہ تو کون ہے؟ وہ اُس کا جواب دیتا تو انوریؔ بھی باولے پن سے اُس کا جواب دیتا مگر اُس کے جوابات میں تمام تر مصنوعی دیوانے پن کے ساتھ ساتھ ذکاوت، ذہانت، ظرافت طبع اور تیزی اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ جو اُس سے بات چیت کرتا وہ پھڑک اُٹھتا۔

لوگوں نے اس دیوانے کو اپنی دلچسپی کا ایک مشغلہ بنالیا اور رشدہ شدہ ابوالفضل کے کان میں بھنک پہنچی کہ کیا خوب ایک دیوانہ فقیر آیا ہے اور مزے کی حجت اور بحث کرتا ہے۔ اب انوریؔ کے لیے اس کے دیوانہ پن نے یہ وقت مہیا کردیا تھا کہ گلیوں کے لونڈے اُس کے پیچھے ''توکیستی؟'' کی تالی دیتے تھے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کو اُن کی تفریح طبع کے لیے اُن کی قابلیت اور لیاقت کی مناسبت سے جواب دیتا اور ہر کسی کو خوب ہنساتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابوالفضل پالکی میں سوار دربارِ شاہی کو جارہا تھا۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ ''توکیستی'' والا دیوانہ لوگوں کے لیے باعث تفریح بنا ہوا ہے۔ ابوالفضل نے پالکی رکوائی اور اُس دیوانے کو بلایا اور اُس سے پوچھا ''توکیستی؟''

انوریؔ دیوانے نے بھی یہی پوچھا۔ ''توکیستی؟'' (تو کون ہے؟)

ابوالفضل نے کہا ''من شاعرم'' (میں شاعر ہوں)

انوریؔ نے جواب دیا: ''من ماعرم'' (میں ماعر ہوں)

ابوالفضل: ''ماعر کرا می گویند؟'' (ماعر کسے کہتے ہیں؟)

انوریؔ: ''شاعرکرامی گویند؟'' (شاعر کسے کہتے ہیں؟)

ابوالفضل: ''ہرکہ شعر گویداوراشاعرمیگویند'' (جوشعر کہتا ہے، اُسے شاعر کہتے ہیں)

انوریؔ: ''ہرکہ معری گویداوراماعرمیگویند'' (جومعر کہتا ہے، اُسے ماعر کہتے ہیں)

ابوالفضل: ''معر چہ چیزاست؟'' (معر کیا ہے؟)

انوریؔ: ''شعر چہ چیزاست؟'' (شعر کیا ہے؟)

ابوالفضل نے اُس کے جواب میں ایک شعر پڑھ کرسنایا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ دیکھو شعر یہ ہوتا ہے۔ اُس کے جواب میں فوراً انوریؔ نے بھی ایک ''معر'' اسی وزن پر فی البدیہ کہہ کرسنا دیا جو اسی بحر میں تھا اور مہمل سا جملہ تھا۔ جس میں لفظ ''معر'' کو لفظ ''شعر'' کے مقابل میں بڑی خوبصورتی سے اس طرح نبھایا تھا کہ ابوالفضل پھڑک اُٹھا۔

پھر جب ابوالفضل کو معلوم ہوا کہ یہ دیوانہ اسی طرح ہرکس و ناکس کو مختلف قسم کے جداگانہ جوابات دیتا ہے تو اور بھی طبیعت خوش ہوئی۔ ابوالفضل نے سوچا کہ اس دیوانے کو بطور تحفہ بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ دیکھیں کہ بادشاہ جب اس سے ''تو کیستی'' کہتا ہے، تب یہ وہاں کیا تماشہ کرتا ہے، چنانچہ اُس کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور دربار اکبری پہنچا۔

دربار اکبری میں اس وقت علمی مشاغل کا دربار لگا رہتا، ایک سے ایک عالم اور فاضل موجود تھا کہ ابوالفضل نے پہنچ کر عرض کی کہ ''حضور ایک عجیب وغریب مگر نہایت دلچسپ دیوانہ لایا ہوں۔ حکم ہو تو حاضر کیا جاوے'' اکبر نے تفصیل پوچھی تو ابوالفضل نے قصہ سنایا اور عرض کی کہ ''بس جہان پناہ اس دیوانے سے یہ سوال کریں کہ ''تو کیستی؟'' اور پھر تماشہ دیکھیں۔

اکبر نے فوراً حکم دیا کہ اس دیوانے کو حاضر کیا جائے چنانچہ انوریؔ کو حضور میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک دیوانہ ہے جو اُجڑی پُجڑی حالت میں فقیروں کی سی حالت بنائے کھڑا ہے۔ (قارئین ذرا تصور میں لائیں ساغر صدیقی کو) معلوم نہیں کہ اکبر نے انوریؔ کی پیشانی پر خداداد ذہانت کا نور بھی دیکھا ہوگا یا نہیں، یہ ایک نور تھا اُس کی طباعی اور ذہانت کا جس نے ابوالفضل کو دیوانہ دربار میں پیش کرنے پر مجبور کیا۔

شہنشاہ کے دلچسپ چہرے پر مسرت آمیز تبسّم کی لرزش تھی اور دوسرے درباری بھی اس عجیب وغریب دیوانے اور بادشاہِ وقت کے دلچسپ مکالمے سننے کے لیے تیار تھے اور مسکرا رہے تھے کہ دیکھیں آج کیا تماشا ہوتا ہے۔ یہ دیوانہ بادشاہ کے سامنے ایک عجیب دھج اور وقار سے مگر مود بانہ کھڑا تھا اور اب گویا دُنیائے علم وادب کے شاید بہترین ڈرامے کا سین ہونے والا تھا۔

شہنشاہ اکبر نے مسکرا کر دیوانے کو مخاطب کر کے پوچھا: ''تو کیستی؟'' بادشاہ کا یہ سوال کرنا تھا کہ دنیائے شاعری میں تلاطم آ گیا:

شاعری جزویست از پیغمبری!

اس دیوانے کی روح شاعری ایک ولولے، ایک جوش اور ایک جذبے کے ساتھ بیدار ہوگئی۔ اس نے پوری شاعرانہ آن بان کے ساتھ اپنا مشہور ومعروف قصیدہ شروع کر دیا! شہنشاہ عالی وقار کا سوال تھا: ''تو کیستی؟'' اب اُس کو اپنا قصیدہ بھی شروع کرنا تھا اور جواب بھی دینا تھا کہ میں کون ہوں۔ سبحان اللہ کیا علمی قابلیت کا شاعر نے جواب دیا ہے، ایک انداز شاعرانہ سے اس دیوانے یعنی انوریؔ

نے بادشاہ کے سامنے کڑک کراپنے ایرانی لہجے میں ایک مترنم مگر بارُعب آواز سے اپنا ہاتھ اُٹھا کر انگلی گھما کر بڑے زوروں میں کہا:

ہیچ مادر کس نہ زاید، زیر چرخ چنبری

بادشاہ نے اور تمام درباریوں نے متعجب اور غیر متوقع نگاہوں سے دیوانے کی طرف دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مشکوک تھیں۔ ابوالفضل اوراس دیوانے کی آنکھیں چار ہوئیں اوراس دیوانے نے پھر اپنی دُھن میں زور دے کر کہا:

ہیچ مادر کس نہ زاید، زیر چرخ چنبری

یہ کہہ کر پھر چاروں طرف گھوم گھوم کر ایکٹنگ کے ساتھ بلند آواز میں ہر چہار طرف دربار میں اس مصرعے کی تکرار کی اور جب لوگ مطمئن اور منتظر ہو گئے تو اُس نے بڑے وقار کے ساتھ بادشاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''پادشاہے، چوں جلال الدین.....''

ایک دم سے خفیف سی لرزش دربار میں پیدا ہوئی کہ اُس نے پھر وقار اور ادب سے بادشاہ کی طرف بتا کر کہا تا کہ شک رفع ہوجائے۔

''پادشاہے، چوں جلال الدین.....''

پھر ایک لرزش سی دربار میں پیدا ہوئی کہ اُس نے بڑے زور کے ساتھ مصرعہ اول کھینچ کر شعر کو پورا کر دیا۔

ہیچ مادر کس نہ زاید، زیر چرخ چنبری
پادشاہے، چوں جلال الدین، گدا چوں انوریؔ

اِدھر اُس نے پادشاہے چوں جلال الدین کہہ کر بادشاہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا اور اُدھر ''گدا چوں انوریؔ'' کے ساتھ مودبانہ طریقے سے جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ مارا کہ یہ انوریؔ ہے۔

بس ایک بجلی تھی کہ تڑاقے کے ساتھ گری۔ شعر نہیں تیر نکلا تھا کمان سے اور سب کے دلوں میں پیوست ہو گیا تھا۔ ابھی تک محض انوریؔ کا نام یا کلام سننے میں آیا تھا اور آج انوریؔ معہ کلام کے نازل ہو گیا۔ سب کے سب انوریؔ اور اس کی عجیب وغریب طرح کی آمد کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آنکھیں سب کی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ واہ! یہ انوریؔ ہے! بادشاہ اُچھل پڑا۔ منہ سے بیساختہ نعرہ تحسین نکل گیا اور قبل اس کے کہ لوگ ہوشیار ہوں کہ ایک شاعرانہ انداز سے انوریؔ دربار اکبری میں آ دھمکا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ شاعر کا منہ فوراً سچے موتیوں سے بھر دو۔ حکم کی دیر تھی کہ میاں انوریؔ کے منہ میں سچ مچ سچے موتی بھر دیئے گئے۔

اِدھر تو انوریؔ کے منہ میں سچے موتی بھرے جا رہے تھے اور اُدھر بادشاہ جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا: ''پادشاہے چوں جلال الدین، گدا چوں انوری!''

ذرا قارئین انوری کی خودداری اور شوخی تو ملاحظہ فرمائیں، غضب کر رہا ہے، کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی ماں بادشاہوں میں جلال الدین اکبر سا بادشاہ نہیں جن سکتی تو فقیروں میں انوری سا بھی پیدا ہونا ناممکن ہے!

شاید اس ادا وانداز سے بادشاہ کے سامنے، خود بادشاہ کے ساتھ اپنی تعریف، اس حسن وخوبی سے نہ تو آج تک کوئی شاعر کر سکا اور نہ کر سکے گا۔ کس اکڑ، مگر کس تمیز کے ساتھ انوریؔ بادشاہ کے سامنے بڑے زوروں میں اپنی خود تعریف کرتا ہے کہ اُس کے

زور بیان اور فصاحت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ شعر کو بار بار پڑھئے اور اُس کی خوبی پر غور کیجیے۔ خود اپنی ہی تعریف گویا شعر کی جان ہے۔ کس خوبی سے قصیدہ شروع کیا ہے، اور ساتھ ہی بادشاہ کے سوال ''تو کیستی؟'' کا جواب بھی دیا ہے اور کس خوبی سے شاعر اپنے ممدوح کے ساتھ خود اپنا ممدوح بھی بن گیا۔ پھر ایسے شعر پر انوریؔ نے ابوالفضل پر گویا چوٹ کی اور اگلا شعر شروع کرنے سے پہلے با آواز بلند کہا۔ ''کہ اگر یہ قصیدہ کسی اور کا ہوتو بہتر ہے وہ خود اُس کو سنا دے مگر وہاں یہ حال کہ انوری برق و رعد بن کر آیا تھا اور ابوالفضل کی طبیعت بھی حاضر نہ تھی۔ وہ سنائے میں تھا کہ خود میرے ہاتھوں یہ کیا ہو گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے انوریؔ نے مطلع ہی میں اپنا تخلص انوریؔ بھی ڈال دیا تھا۔

چنانچہ اس کے بعد انوریؔ نے بڑے زوروں کے ساتھ اپنا قصیدہ بادشاہ کو پورے کا پورا سنایا اور بے طرح خراج تحسین وصول کی۔

افسوس صد افسوس کہ اب نہ اکبر سا اُمی اور اَن پڑھ مگر عالم بادشاہ ہے اور نہ کوئی انوریؔ سا صاحب کمال ہے، کیا کیا قدر دان آئے اور کیا کیا صاحب کمال آئے، اب تو میاں شہباز شریف جیسا وزیر اعلیٰ ہے جو دائیں بازو کا نمائندہ ہو کر بائیں بازو کے انقلابی شاعر حبیب جالبؔ کے انقلابی اشعار ٹھُتھلا ٹھُتھلا کر پڑھتا ہے مگر کام سارے سرمایہ داروں والے اور سرمایہ داروں کے مفاد میں کرتا ہے۔ مزدور کے حق میں ایک بھی نہیں جن کے ساتھ جالبؔ تھا۔ اگر منہ پر بھولے سے قاسمی کا کوئی شعر آ جائے تو دال میں کرک کی طرح تھوک دیتا ہے۔ اب اُن سب کی یاد ہمارے لیے ایک قصۂ ماضی اور رنگین فسانہ بن کر رہ گئی ہے!

جی اوے، خوشونتیا!

ننانوے اُس نے اپنے گھر کے باہر لکھوا دیا تھا اور سینچری کرنے کا آرزومند تھا، ہر اُس بیٹسمین کی طرح جو پہلی بار اس ہند سے کو چھوتا ہے مگر بُرا ہو یم راج کا، جس نے 20 مارچ 2014ء کی صبح نو بال کرواتے ہوئے خشونت سنگھ کو رن آؤٹ کر دیا۔ خشونت سنگھ کو اپنی کریز سے قدم نکالے ابھی صرف ایک ماہ ہی گزرا تھا۔ 15 فروری 1915ء کو ہڈالی خوشاب، پاکستان میں پیدا ہونے والے خشونت سنگھ نے اپنا زمانۂ طالب علمی گورنمنٹ کالج، لاہور میں گزارا۔ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج، لاہور سے ایل ایل بی کرنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس بھی کی۔ اصل نام اور مقام ہندوستان میں کمایا۔ ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA جیسے مشہور جریدے کے ایڈیٹر رہے جس میں قرۃ العین حیدر جیسی نامور قلم کار انہیں اسسٹ کرتی تھیں۔ ناول: TRAIN TO PAKISTAN اُن کے ابتدائی اَدبی نقوش مین شمار ہوتا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: ''اس ناول میں خشونت سنگھ نے قیامِ پاکستان سے وابستہ المیہ حالات کے تناظر میں انسانیت کی اقدار اُجاگر کی ہیں۔ یہ ناول 1947 کی دستاویز بھی ہے اور جذباتی روداد بھی! معاصر بھارتی اہلِ قلم میں خشونت سنگھ مقبول بھی ہے اور متنازعہ بھی، مقبول اس لیے کہ سکھ ہے اور متنازعہ بھی اس لیے کہ سکھ ہے۔ انگریزی زبان میں پنجابی کا تڑکا لگا کر دوٹوک بات کرتا ہے، تلخی کو خوشنمائی سے کیموفلاج نہیں کرتا اور کیکٹس کو گلاب والے گلدان میں نہیں سجاتا۔ اس کی تحریر زندگی، معاشرہ، عصر، مرد، عورت (حتیٰ کہ خود بھی) بالحاظ طرزِ عمل جیسے ہیں ویسے ہی پینٹ کیے جاتے ہیں۔ اس کی خودنوشت:

TRUTH, LOVE & A LITTLE MALICE

(سچ، محبت اور ذرا سا کینہ) تک، ہر نو کی تحریر اُس کی بے ریا بے باکی کی مظہر ہے۔'' (دیباچہ: ٹرین ٹو پاکستان، مطبوعہ: لاہور، پاکستان)

ناول: ٹرین ٹو پاکستان کرافٹ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور اس سے مستنصر حسین تارڑ جیسے نئے ناول نگار ناول کی بہت سی باریکیاں سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ خشونت سنگھ نے اس ناول میں ایک ایسے گاؤں کی کہانی بیان کی ہے جس میں کسی کے پاس گھڑی نہیں۔ وہاں کے باسی ریل گاڑیوں کی آمدورفت سے وقت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ کوئی بھی قلم کار جب اپنے فن کی معراج پالیتا ہے تو اُسے تجربات کرنے چاہئیں، جیسا کہ خشونت سنگھ نے ناول: ''دِلّی'' کی بُت کاری کے سلسلے میں کیے۔ فاصلہ، محبت اور منظر میں کشش اور خوبصورتی پیدا کر دیتا ہے۔ ہم پر یہ سچائی TRAIN TO PAKISTAN کے بعض ٹکڑے پڑھنے کے بعد آشکار ہوتی ہے۔ کسی بھوکے، پیاسے پیٹ سے اُٹھنے والی پکار اس دنیا میں تذلیل انسانیت کا نوحہ ہے۔ خشونت سنگھ نے یہ درد، ناول کے اختتام کی جانب کامیابی سے بڑھتے ہوئے فوجی سندر سنگھ والے واقعے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ صرف احساس زندہ ہونا، درد محسوس کرنے کی واحد شرط ہے۔

1954ء میں خشونت سنگھ کو "GROVE PRESS AWARD" برائے فکشن ملا۔ 86-1980ء تک ممبر

پارلیمنٹ بھی رہے۔ 1974ء میں خشونت جی کو صدرِ ہندوستان کی طرف سے ''پدما بھوشن ایوارڈ'' ملا جوانہوں نے 1984ء میں گولڈن ٹمپل کی بے حرمتی پر بطور احتجاج واپس کر دیا۔ ''دِلّی'' اُن کا بیسٹ سیلر ہے جس کی تصنیف پر خشونت سنگھ نے اپنی زندگی کے بیش قیمت برس صرف کیے۔ اس ناول میں انھوں نے ایک جداگانہ تیکنیک اپنائی ہے۔ وہ ماضی اور حال، باری باری دونوں کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے قاری کو ایک انوکھی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ انھوں نے دِلّی کی کہانی ابتدائی ادوار سے زمانہ حال تک رقم کی ہے۔ تاریخ نے ان کو ناول کا ڈھانچہ فراہم کیا جس کو انہوں نے متشکل کیا اور اس کی رگوں میں خون دوڑایا۔ خشونت سنگھ کا نام انگریزی ادب میں معتبر جانا جاتا ہے۔ اُن کا تعلق ادیبوں کی اُس ٹولی سے ہے جن پر ترقی پسندی کی گہری چھاپ ہے۔ ہر موضوع پر کھل کر لکھنا اُن کا بنیادی وصف ہے۔ حقیقت نگاری کا دامن وہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ تاریخ جیسے موضوع پر ہاتھ ڈالنا کسی عام فکشن رائٹر کے بس کی بات نہیں۔ تاریخ سے ناواجب سلوک کرنے والوں میں سے بہت سوں کو آپ نے بھی پڑھا ہوگا، میں نے بھی پڑھا ہے۔ مگر تاریخ کی خاطر روتے کسی کو آپ پہلی بار محسوس کریں گے۔ سچائی ہی ناول: ''دِلّی'' کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ناول ''دِلّی'' قاری کو وہ سب کچھ دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور اُسے مسرت سے لبریز کر دیتا ہے۔ تاریخ کی کرید میں رہنے والے کے لیے ناول ''دِلّی'' میں بہت کچھ ہے جس کی ایک اور خوبی وہ زاویہ نگاہ ہے جس کے زیر اثر یہ ناول لکھا گیا ہے کیونکہ دِلّی کی تاریخ میں دو بڑی قوموں (ہندو، مسلمان) کا غالب حصہ رہا۔ اس لیے ان دونوں قوموں کے افراد جو بھی تاریخ لکھیں گے وہ کسی نہ کسی شکل میں جانبدارانہ ضرور ہوگی مگر خشونت سنگھ کا تعلق سکھ مت سے ہے۔ یوں انھوں نے ''دِلّی'' کی تاریخ پر مبنی ناول لکھتے ہوئے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ ناول کا اختتام اندرا گاندھی کے قتل پر ردِعمل کے نتیجے میں سکھ قوم پر ہونے والے ظلم وتشدد پر کیا گیا ہے جس کا نمائندہ کردار ''بدھ سنگھ'' ہے۔ ناول کا یہ اختتام پڑھتے ہوئے ہمیں اشفاق احمد کا مشہور افسانہ ''گڈریا'' بھی یاد آجاتا ہے۔ خشونت سنگھ کا یہ اندازِ فکر یقینا ''اکثریت'' کو پسند نہیں آیا ہوگا مگر اس کے باوجود ناول کو بے حد پذیرائی نصیب ہوئی اور ''دِلّی'' کثیر الاشاعت ناولوں میں شامل ہے۔

خشونت سنگھ نے ناول کو جس طرح ماضی اور حال کی غلام گردشوں میں دوڑایا ہے وہ عمل قاری کو ناول کے آغاز میں تو نامانوس سا ضرور محسوس ہوگا مگر رفتہ رفتہ IN-OUT کے اس عمل کا عادی ہو کر وہ METRO بھی بھول جاتا ہے اور ریل کار بھی۔ یہی ناول اور ناول نگار کا کمالِ فن ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، خشونت سنگھ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''بین الاقوامی شہرت کے حامل خشونت سنگھ کا متحرک قلم کہیں ایک موضوع کا پابند نہیں۔ قلم کی دیوی سرسوتی اُس پر بے حد مہربان ہے۔ ناول کا مرکز اور محور افراد نہیں بلکہ ''دِلّی'' ہے۔ ہر چند کہ کرداروں کے روپ میں اس میں افراد بھی ملتے ہیں۔ یہ دِلّی کی تاریخ نہیں بلکہ تاریخ کے تناظر میں دِلّی کا مرقع ہے۔ اسی لیے خشونت سنگھ کا یہ ناول معاصر ناولوں سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس میں کسی روایتی ہیرو یا ہیروین کے جذباتی المیے کا قصہ نہیں۔ یہ دِلّی شہر کی داستان ہے۔ اس کا ہیرو یا ہیروئین جو بھی نام دے لیں ''دِلّی'' ہی ہے۔ ناول میں خشونت سنگھ بھی بطور ایک کردار شامل ہے۔ وہ مختلف کہانیوں کے درمیان بھی نمودار ہوتا ہے۔ یوں خشونت سنگھ بطور کردار مختلف کہانیوں میں باہمی رابطے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا قتل عام ''دِلّی'' کا مقدر قرار پایا۔ ناول کا آخری اور بے حد موثر باب اندرا گاندھی کی چِتا جلائے جانے کے موقع پر سکھوں کے قتل عام پر ختم ہوتا ہے۔ بُدھ سنگھ

جو بظاہر بدھو نظر آتا ہے اور جس کا بے معنی وجود بے مصرف دکھائی دیتا ہے اچانک ہیرو میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ایک سکھ کی شان کے ساتھ جان دیتا ہے۔ اِدھر اندرا گاندھی کی چِتا روشن ہوتی ہے اُدھر بُدھ سنگھ کو زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ یہ تقابل بذاتِ خود گہری معنویت کا حامل ہے۔ اس باب میں خشونت سنگھ کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سکھ ہوتے ہوئے بھی اُس نے غیر جذباتی انداز اور ہذیانی اسلوب اپنائے بغیر، مورخ جیسی غیر جانبداری مگر لاتعلقی سے نہیں، تمام احوال قلم بند کیا ہے۔ (مضمون دِلّی یاترا)

پاکستان سے شائع ہونے والے خشونت سنگھ کے اُردو تراجم کے طفیل جوادنظیر (پانچواں درویش) خشونت سنگھ کے لطیفوں کی بدولت کالم نگار بنا اور لطیفوں کا سٹاک ختم ہوتے کالمانہ صفات سے محروم ہو گیا۔ زیرِ غور گورنر عطاء الحق قاسمی اور ''حلقۂ عطائیہ'' کے راندۂ درگاہ امجد اسلام امجد، خشونت سنگھ کے لطیفے جنرل ضیاء الحق کو سنانے کی خاطر ''بھاگ لگے رہن'' کہتے ہوئے سناتے رہے اور وہی لطیفے نواز شریف کے لیے بھی REPEAT ٹیلی کاسٹ ہوئے۔

خشونت سنگھ سے ایک بار ٹی وی انٹرویو میں پوچھا گیا کہ وہ سکھ قوم کو دنیا کی دیگر اقوام سے منفرد کس لحاظ سے سمجھتے ہیں؟ تو جواباً انہوں نے سکھ قوم کی دو خوبیاں بتائیں: پہلی تو یہ کہ سکھ قوم خود پر ہنسنے کا ظرف رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ سکھ قوم چھین کر تو کھا سکتی ہے لیکن بھیک نہیں مانگتی۔

میرے خیال میں یہ دو بہت بڑی خوبیاں ہیں جو قوم ان خوبیوں کی مالک ہو اُسے عظیم قوم کہنے میں ہمیں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ایک اور خوبی میری نظر میں اس قوم کی یہ ہے کہ اُن کی عبادت گاہ ''گردوارہ'' کو کسی بھی مذہب کا آدمی بوقت ضرورت بطور سرائے استعمال کر سکتا ہے۔ جہاں صرف انسان (بغیر کسی سفارش کے) ہونے کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ اُسے یہ طعنہ نہیں دیا جاتا کہ اُس کی آمد سے عبادت گاہ ناپاک ہوگئی یا اُس کی بنیادیں ہل گئیں اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ انسانیت کا یہ احترام بھی میری نظر میں سکھ قوم کی تیسری بڑی خوبی ہے۔

پاکستان میں بھی ایوان صدر کے دروازے پھگول کی سرائے کی طرح ضیاء دور میں کھلے رہے تھے لیکن صرف جالندھریوں اور مولویوں کے لیے۔ جب کہ مساجد کو دھماکوں کے باعث تاریخ میں پہلی بار تالے بھی ضیاء دور میں ہی لگے جو کم اَز کم مسلمان پردیسیوں کے لیے تو چشم براہ رہا کرتی تھیں۔

خشونت سنگھ محنتی، کام کی سوجھ بوجھ رکھنے والا پڑھا لکھا انسان دوست اور مشہور آدمی تھا۔ انھوں نے کئی بار پاکستان کا دورہ بھی کیا۔ امرتا پریتم کی طرح دل پتھر کا نہیں کیا۔ میں نے اُن کا ناول: ''دِلّی'' ترجمہ کیا تو خوش ہو کر مجھے پہلے ''چھوٹا بھائی'' کہا اور پھر ''عرفان سنگھ'' کا خطاب دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری کتاب: ''شہاب نامہ کی حقیقت'' کا انگلش میں ترجمہ:

LIFE AND TIMES OF QUDRAT-ULLAH SHAHAB

کے نام سے کر کے مجھے بھجوایا جو کہ میں اُن کی 100ویں سالگرہ پر شائع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ارادہ اب بھی یہی ہے کہ انگلش ترجمہ اگلے سال 15 فروری یعنی اُن کی سوویں سالگرہ پر شائع ہو جائے مگر اب وہ کتاب خشونت جی تو دیکھ نہیں پائیں گے۔ یم راج! تُو نے اچھا نہیں کیا!

گشتا

جو بھی آزادمہدی کو نہیں جانتا جان لے کہ وہ فکشن کو شاہدرہ پنڈ سے نکالنے کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ ذاکرانہ سٹائل میں اگر کسی نے ناول سننا ہو تو دفتری اوقات میں جا کر اس سے انٹرمیڈیٹ بورڈ، لاہور میں مل لے۔ مرد ہونے کی صورت میں وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ سادہ پانی پوچھے گا اور اپنے کسی بھی زیرِتعمیر ناول کا باب بڑے سٹائل سے سنانا شروع کرے گا۔ خاتون ہونے کی صورت میں وہ یہ اہتمام کرے گا کہ اپنی میز کی دراز سے ڈسپوزیبل ریزر نکالے گا اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے رُخ روشن کو مثل آئینہ سامنے رکھتے ہوئے خود اپنی شیو بنائے گا۔ دیکھنے والی دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی۔ ہاں! خاتون کی موجودگی میں ایک اہتمام اور بھی کرے گا کہ پنجابی چھوڑ کر اُردوئے معلیٰ بولنے کی کوشش کرے گا چاہے بعد میں جبڑا درد کرتا پھرے، مگر یہ رسک لے جائے گا۔ لیکن ایک بات ہے اُردو بولتا ہوا ڈاکٹر امجد طفیل اور زاہد حسن کی نسبت بہت بہتر لگتا ہے۔ مذکورہ صاحبان تو اُردو بولتے ہوئے بکر منڈی کے آڑھتی لگتے ہیں۔ اگر آپ نے تواتر سے گردن ہلانے کی سینچری مکمل کی اور اپنی باڈی لینگویج سے ناول کے باب میں مکمل دلچسپی ظاہر کی تو آپ چائے کا گرم کپ انعام میں پائیں گے مگر آپ کو چائے کا پورا کپ وہ کبھی پینے نہیں دے گا بلکہ کلرکانہ عاجزی اور لجاجت کا ایک نادر نمونہ بن کر آپ سے کہے گا: ''آپ کے ساتھ تھوڑی سی چائے میں بھی نوش فرما لیتا ہوں'' یہ کہہ کر اپنے آس پاس پڑا پانی کا کوئی خالی گلاس یا رنڈوا کپ اُٹھا کر اُس میں آپ کے لبالب کپ سے آدھی چائے لے کر اُسے ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ مگر آپ اس عمل کمینائی کا صدمہ سہتے ہوئے باقی ماندہ چائے سے ٹکور کریں گے۔

اپنے ناول کے باب کا بقیہ حصہ سناتے ہوئے یہ اپنے مونہہ میں نسوار رکھنے کا وقفہ بھی کرے گا اور اپنے جملوں کی خود ہی جگہ جگہ داد بھی دے گا۔ آپ کے ہاتھ پر ہاتھ مارے گا یہ کہتے ہوئے: ''کیا جملہ لکھ دیا ہے میں نے'' یہ بکریوں جیسی ''میں، میں'' اس نے مستنصر حسین تارڑ سے سیکھی ہے جس کی کوئی تحریر ''میں، میں'' سے خالی نہیں۔

باب اتنا طویل ہوگا کہ درمیان میں کھانے کا وقفہ خود بخود آ جائے گا۔ کسی زمانے میں اس کے گھر سے آنے والے پراٹھے کے صرف دو حصے ہوا کرتے تھے۔ ایک میزبان کے لئے اور دوسرا مہمان کے لئے۔ لیکن جب سے اس نے اپنا بیٹا بورڈ میں بھرتی کروایا ہے اُس مظلوم پراٹھے کے تین ٹکڑے ہونے لگے ہیں۔ اپنے بیٹے کی تعلیمی استعداد کے بارے میں بڑا فکرمند رہتا ہے اور اُسے ماں سے بڑھ کر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ اپنے ہر ملاقاتی کو بتا چکا ہے کہ اُس نے اپنے بیٹے کو کمپیوٹر والے پریکٹیکل میں اثر ورسوخ سے کام لے کر اعلیٰ نمبر لگوائے مگر اس نالائق نے تھیوری میں فیل ہو کر کھوتا کھوہ میں ڈال دیا۔ یہ سُن کر اُس کے اکثر مفاداتی ملاقاتیوں کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور کچھ گلیسرین یا پیاز طلب کرنے لگتے ہیں۔ رونے دھونے کے ویسے بھی یہ خوش خطی کی طرح اضافی نمبر دیتا ہے۔ آزادمہدی کو کالجوں میں پڑھانے والا ہر وہ رائٹر، رائٹر مانتا ہے جس کا کوئی کام بورڈ میں پھنسا ہو یا اُس نے سینٹرل مارکنگ یا کسی امتحانی مرکز میں اپنی ڈیوٹی لگوانی ہو۔

سینٹرل مارکنگ سے یاد آیا ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین، کوپر روڈ لاہور میں سینٹرل مارکنگ ہو رہی تھی۔ آزاد

مہدی اس سینٹرل مارکنگ کے ایک حصے کا انچارج تھا۔ اس نے ڈاکٹر علی ظہیر منہاس کی کوئی بے ضابطگی اس کی معشوقہ طاہرہ سرور (لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی، لاہور) سمیت پکڑ لی اور اس موقع پر اپنے تاریخی خطاب کے دوران بڑے دبنگ انداز میں جو جملہ کہا وہ سینٹرل مارکنگ کرنے والوں کے کانوں میں آج بھی سکندرِ اعظم کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی طرح گونج رہا ہے: ''اِدھر آؤ ڈاکٹر تمہیں ایک ناول نگار بلا رہا ہے'' یہ آزاد مہدی کی عظمت تھی کہ اس نے جسے ''ڈاکٹر'' کہہ کر بلایا تھا اس کا Ph.D کا تھیسس ریکارڈ سے غائب تھا۔ یعنی ڈگری (قبر) تو موجود تھی مگر مقالہ (مردہ) غائب تھا۔ ورنہ پرسنیلٹی اور گھوڑا ہسپتال سے قربت کے باعث علی ظہیر منہاس ڈنگر ڈاکٹر لگتا ہے۔ نظم کے حوالے سے علی ظہیر منہاس نے اپنے تھیسس کا شہرہ وزن کے حساب سے اپنے حلقہ احباب میں کروایا تھا۔ علی ظہیر منہاس کا دعویٰ تھا کہ اُس کا تھیسس یونیورسٹی کی تاریخ میں صحت مندترین تھیسس ہے اور بڑے آپریشن سے پیدا ہوا ہے۔

آزاد مہدی مجھ سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتا ہے اور لاڈا سا بن کر انتہائی ذاتی باتیں کر جاتا ہے۔ کبھی وہ مجھے بتائے گا کہ اُس کی قبض اور بیلٹ ٹوٹے ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ کبھی پینٹ کی ٹوٹی ہوئی زِپ کا رونا روئے گا یا پھر یہ بتا کر دُکھی کر دے گا کہ اُس کا انڈر ویئر ڈھیلا ہو کر اب اُس کے گھٹنوں تک آنے لگا ہے۔ کھانا کھلانے اور کھانے کو دوستی کی معراج سمجھتا ہے۔ میں نے جو تین یادگار کھانے اس دوستی کے سفر میں کھائے اُن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پہلی بار اُس نے مجھے فون کر کے افراتفری کے عالم میں کھانے پر بورڈ کے دفتر بلایا۔ دس ہزار روپے والا پرائز بانڈ اُن دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ میرے دوست کا پہلا انعام نکل آیا ہے۔ تب اُس نے مجھے گلاب جامن کے ساتھ روٹی کھلائی اور اس لنچ کی عباس اطہر کی طرح یہ لیڈ نکالی: ''کھانے کا کھانا، سویٹ ڈش کی سویٹ ڈش'' میں آزاد مہدی کی اس حرکت پر سخت خفا ہوا اور آئندہ کے لئے دل ہی دل میں توبہ کی۔ چار چھ مہینے بعد حضرت آزاد مہدی نے مجھے پھر لنچ کی دعوت دی اور ناک گھسنی کر کر کے یقین دلایا کہ تاریخ نہیں دہرائی جائے گی۔ اِس بار لنچ پہلے سے بھی زیادہ عبرت ناک ثابت ہوا۔ آزاد مہدی نے ریڑھی پر لگی مجھے آلو کی دو ٹکیاں کھانے کو دیں اور نان پکڑاتے ہوئے لنچ شروع کرنے کو کہا اور خود ٹکیوں کے ساتھ ملنے والی چٹنی سے نان کھاتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کفایتی دور کی یاد تازہ کرنے لگا۔ ڈوب مرنے کا مقام تھا میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ میزبان چٹنی سے نان کھائے اور مہمان ٹکیوں کے ساتھ۔ چٹا دن چڑھا تھا۔ چراغ بُجھانے کا اہتمام بھی ممکن نہ تھا۔ میں نے آزاد مہدی کو اپنے ساتھ آلو کی ٹکیوں میں فراخ دلی کے ساتھ شریک کیا اور آئندہ کے لئے پکی توبہ کر لی۔ یہ پکی توبہ بھی آزاد مہدی نے دو چار مہینے بعد اتوار کی چھٹی والے دن فون کر کے تڑوا دی۔ میں نے جب ماضی قریب والے دو تاریخی کھانوں کا اُس سے گلہ شکوہ کیا تو اُس نے مولا علیؑ کی قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ آج کی تاریخ میں ایسی حرکت قطعاً نہیں ہوگی۔ بریانی آئے گی۔ PEPSI کی ڈھائی لیٹر والی فل ٹھنڈی بوتل بھی اور بعد میں سویٹ ڈش بھی۔ میں معصوم ایک بار پھر آزاد مہدی کے جھانسے میں آ گیا۔ یاد رہے مجھے معصومیت کا لوہا توڑ سرٹیفکیٹ آرٹسٹ ریاظ نے دے رکھا ہے جسے منسوخ کروانے کی کوشش اشرف سلیم (دستاویزی فیم) بارہا کر چکا ہے۔

بریانی بھی آئی، پیپسی بھی آئی اور فرنی بھی مگر رشوت کے پیسے سے جو آزاد مہدی نے اتوار والی دیہاڑی لگاتے ہوئے طالب علموں سے بورڈ کی فرنچائز لگا کر اُن کا بورڈ میں پھنسا ہوا کوئی کام کروا کر اس کھانے کی صورت میں وصولے تھے۔ رشوت لینے کا

پتہ مجھے ایسے چلا کہ آزادمہدی نے کاغذ کی ایک چٹ پر اپنا موبائل نمبر 0308-4360106 لکھ کر ایک نوجوان کو دیا اور کہا: ''بھاگ کر میرے نمبر پر 100 کا لوڈ تو کروادو۔ واپسی پر تمہارا کام تیار ہوگا'' سب کے سامنے میں آزادمہدی کو کیا کہتا۔ جیسے تیسے کھانا کھایا اور اپنے آپ کو کوستا وہاں سے چلا آیا۔ میں اُس باپ کا بیٹا تھا جس نے محلے کے ایک رشوت خور کے گھر سے دعوت کھانے کے بعد رشوت کا پتہ چل جانے پر اپنے حلق میں اُنگلیاں مار مار کر سارا کھایا پیا باہر نکال دیا تھا۔ مگر اس واقعے کو ہوئے بھی 40 برس سے اوپر گذر چکے تھے۔ زمانہ خاصی حد تک بدل چکا تھا۔ اب حلال وحرام ایک دوسرے کے ویسے جانی دشمن نہ رہے تھے بلکہ دل دے جانی بن گئے تھے۔ آزادمہدی کے کھانوں کی حد تک میں وہ مومن تھا جو ایک ہی سوراخ سے 3 بار ڈسا گیا۔

اگر آزادمہدی کے فن پر بات کی جائے توسیف اللہ خالد فاران (2004ء) میں لکھتے ہیں: ''آزادمہدی اس ادبی روایت کی سنہری کڑی ہے جس نے اسلامیہ کالج، سول لائنز کے فرزندانِ رشید، ڈاکٹر غلام علی چوہدری، صدیق سالک، سہراب اسلم، شبانہ یونس، شکیل زاہد، علی جاوید نقوی اور سلمان صدیق جیسے کہانی کاروں کے تجدد پسند اجتہاد سے تشکیل پائی۔'' جبکہ میری نظر میں اس کے ذہن پر روسی رائٹرز بری طرح سوار نظر آتے ہیں۔ وہ جس طرح اپنے ناولوں میں ''آپ''، ''جناب'' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے اور طویل ترین منظر کشی کرتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ آپ کوئی ترجمہ پڑھ یا سن رہے ہیں۔ رشین ناول پڑھتے ہوئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ناول کے لئے روس کا موسم بہترین تھا جہاں سال کے 10 مہینے برف رہتی ہے۔ لکھنے والا اندر بیٹھ کر لکھتا چلا جا رہا ہے اور پڑھنے والا پڑھتا چلا جا رہا ہے۔ برصغیر کا موسم ناول کو نہیں شاعری اور افسانے کو راس ہے۔

محلہ سنگتراشاں، شاہدرہ پنڈ میں رہ کر اُسے اپنی تحریر کچھ زیادہ ہی بنانے سنوارنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن ممتاز مفتی کی طرح لکھتا اتنا بڑا، بڑا اور کھُلا کھُلا ہے کہ لگتا ہے بلیک بورڈ پر لکھ رہا ہے۔ سرکاری سٹیشنری کا ایسا اُجاڑا میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ اَدب آداب کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ ایک بار ایبٹ آباد کے سلطان سکون کو جو آزادمہدی سے کم از کم 30 سال زیادہ بڑے ہیں، خط میں ''عزیزم'' لکھ کر اُن کا سکون تباہ کر ڈالا۔ انہوں نے فوری جواب میں آزادمہدی کو بڑی شائستگی سے لکھا کہ ''عزیزم'' بڑے کو نہیں ''چھوٹے'' کو لکھا جاتا ہے۔ عزیزم کی مثال ایک بڑے کے لئے ویسی ہی ہے جیسا انگلش کا محاورہ ہے: "Who Is She?" یعنی کسی مرد کے حوالے سے ایسا کہا جائے۔ کچھ ایسی ہی حرکت آزادمہدی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں اسلامیہ کالج، سول لائنز کے صدر شعبہ اُردو شہرت بخاری کے ساتھ بھی کی۔ انہیں یہ کہہ کر چونکانے کی کوشش کی: ''سر! میں نے رُباعی کہی ہے'' شہرت بخاری نے آزادمہدی کو گھورتے ہوئے کہا: ''رُباعی تو ''اقبال'' نہیں کہہ سکا تو کہاں سے کہے گا؟'' یہ کہا اور آزادمہدی کو بھگا دیا۔

اب قاری مجھ سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ اگر آزادمہدی اتنا ہی فضول آدمی ہے تو میں اُس سے دوستی کیوں رکھے ہوئے ہوں؟ تو میرا قاری جان لے کہ آزادمہدی کا مجھ پر ایک ایسا احسان ہے جس کی وجہ سے میں اُسے نہ بھلا سکتا ہوں نہ چھوڑ سکتا ہوں۔ وہ ہے شبنم مرزا۔ شبنم مرزا سے مجھے متعارف آزادمہدی نے ہی کروایا تھا۔ مگر بعد میں آزادمہدی کو شاید غلطی کا احساس ہوا کہ اُس نے اپنے علاقے کی آبرو کو مجھ سے ملوا کر ٹھیک نہیں کیا۔ پھر آزادمہدی اور شبنم مرزا کے درمیان جو تکلیف دہ معاملات ہوئے وہ ناقابل تحریر ہیں۔ آزادمہدی اور شبنم مرزا کے راستے الگ ہو گئے مگر میں بدستور دونوں سے تعلق رکھے ہوئے ہوں۔ اسے میری

دوستانہ کمزوری سمجھ لیں یا کچھ اور، میرا مزاج ایسا ہی ہے۔

آزاد مہدی اَدبی شطرنج پر سجا ہوا وہ مہرہ ہے جو دائیں بائیں آگے پیچھے پھرتا ہے اور ہر جگہ ہر قسم کے لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہے۔ وہ صاحبِ اسلوب فکشن رائٹر تو ہے ہی شاعرانہ نثر بھی لکھتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا جیسی نہیں، ویسی جیسی فدا حسین پر اُترتی ہے اور وہ اُسے آزاد مہدی کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ نثر میں شاعری بھی کرتا ہے۔ ممکن ہے کبھی کبھی کسی مشاعرے میں پڑھتا بھی ہو۔ شاہدرے کی حدود میں تو وہ لازماً ایسی حرکت کرتا ہوگا کیونکہ وہاں کا ایم-این-اے ملک ریاض اُس کا کلاس فیلو رہا ہے اور لطیف ساحل جو ساحل سنیما شاہدرہ کا مالک تو نہیں مگر اَدبی ذوق کا مالک تو بہرحال ہے وہ آزاد مہدی کو کہاں نظرانداز کرتا ہوگا۔

''رنڈیاں تو رنڈاپا کاٹ لیتی ہیں مگر چھڑے نہیں کاٹنے دیتے'' کچھ یہی معاملہ رائٹرز کے ساتھ بھی رہتا ہے۔ اُن کے پرستار کبھی بھول کر پوچھ لیں کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں تو انہیں لکھنا یاد آ جاتا ہے۔ پھر وہ ناصر زیدی کی طرح رکشے میں بیٹھ کر بھی غزلیں کہنے لگتے ہیں جو رستے میں آنے والے ہر سپیڈ بریکر پر جھٹکے اور سکتے کا شکار ہو جاتی ہیں یا اصغر ندیم سیّد کی طرح انہیں کانفرنس میں پڑھنے والا مضمون لکھنے کے لئے ہوائی سفر کے دوران ہر بڑے کی سیٹ پر خیالات کی خیرات لینے کے لئے فرداً فرداً جانا پڑتا ہے۔ چونکہ تعلق پیروں فقیروں کے شہر ملتان سے ہے اس لئے انتظار حسین جیسے مومن بھائی ترس کھا کر مضمون کے سلسلے میں کچھ لکھوا بھی دیتے ہیں۔ مگر بغضِ معاویہ رکھنے والے مضمون میں ایسی فاش غلطیاں اور غلط تاریخیں ڈلوا دیتے ہیں جو پڑھتے ہوئے گلے پڑ جاتی ہیں جیسا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے ایک انٹرنیشنل سیمینار کے لئے رات کو ہوٹل کی لابی میں لکھے جانے والے ہنگامی مضمون کے دوران ہوا۔ کاتا اور لے دوڑی کے مصداق مضمون میں کالے صاحب کا حوالہ دیا تو اپنے دور کی مشہور روحانی شخصیت کا مکراُ سے شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کے مرشد کے طور پر انگریزوں کا ٹاؤٹ ثابت کر دیا۔ آزاد مہدی بھی اپنے پرستاروں کی خاطر ایک کتاب لکھ رہا ہے جس کا نام ہے: ''کبھی تو کام نکلے گا'' یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو آزاد مہدی سے مفت میں اپنے کام نکلوا کر بھاگ گئے اور دوبارہ شکل نہیں دکھائی۔

آزاد مہدی کچھ معاملات میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کی برابری کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی یہ شعور رکھتا ہے کہ کس بندے سے کیا کام کس وقت لینا ہے۔ کس کو دو انگلیوں والا اسلام کرنا ہے اور کس سے پورا ہاتھ ملانا ہے اور کس سے افتخار عارف کی طرح جپھا مار کر ملنا ہے۔ اکیڈمی آف لیٹرز، لاہور کے کلرک جمیل کو حسین و جمیل کب کہنا ہے اور ذلیل کب کرنا ہے۔

آزاد مہدی نے شاہدرہ میں تھرڈ کلاس کرکٹ بہت کھیلی ہے اور مشہور قومی کرکٹر عبدالرزاق کو NET PRACTICE بھی کرواتے رہے ہیں۔ ایک روز جانے کیا جی میں آئی کہ عبدالرزاق کو چیلنج کر دیا کہ آج ہم دونوں میں سے کوئی ایک ریٹائرمنٹ کا پکا اعلان کرے گا۔ عبدالرزاق نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے اور للکارتے ہوئے یہ چیلنج قبول کر لیا اور ہر طرف اس چیلنج کی دھوم مچ گئی۔ ویسے اس بات کی آئینی حیثیت دیکھنی پڑے گی کہ کوئی تھرڈ کلاس کرکٹر، فسٹ کلاس کرکٹر کو اسی طرح کا چیلنج دے بھی سکتا ہے یا نہیں؟ بہرحال چیلنج والے دن شاہدرہ کرکٹ سٹیڈیم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی حالانکہ وہاں کلچے نہیں لگ رہے تھے۔

آزاد مہدی المعروف ''باوا جی'' اپنی سپن باؤلنگ کے لیے مشہور ہے۔ عبدالرزاق نے آزاد مہدی کی پہلی 3 گیندیں تو بڑے احترام کے ساتھ، تقریباً رکوع میں جاتے ہوئے روک کر کھیلیں مگر اگلی 21 گیندوں پر اُس نے جو چھکے لگائے وہ اہل شاہدرہ کو

ابھی تک یاد ہیں۔اب یہ بتاتے کی ضرورت نہیں کہ اُس روز کس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا ہوگا؟

اسی طرح ایک دن آزادمہدی کو کچہری کے پاس ایک ہیوی ڈیوٹی گاڑی نے رُک کر، رکنے کا اشارہ کیا۔فرنٹ سیٹ سے ایک ڈشکرا اُتر کر آیا اور آزادمہدی کو گلے لگا کر بتایا کہ وہ اُس کا پرستار ہے اور اُس کی کتابیں شوق سے پڑھتا ہے۔ظاہر ہے آزادمہدی کو اس بات پر خوشگوار حیرت ہوئی۔پرستار نے آزادمہدی کو اپنے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بٹھا لیا اور وہ کئی گھنٹے لاہور کی سڑکوں پر لانگ ڈرائیو کرتے رہے۔اس دوران آزادمہدی کو گاڑی کے عقب میں کچھ لوڈ کرنے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں۔اس سفر کا اختتام سگیاں پُل کے پار ہوا جہاں آزادمہدی کے پرستار نے اپنے ٹرک کا سارا کوڑا اچھینک کر ٹرک خالی کر دیا اور آزادمہدی کوڑے کے ڈھیر میں جانے سے معجزانہ طور پر بچا۔آزادمہدی کے پرستار نے اُسے واپسی کے سفر میں شاہدرہ پنڈ ڈراپ کیا۔اس طرح آزادمہدی کی اپنے پرستار سے جان خلاصی ہوئی۔جان بچی سو لاکھوں پائے۔لوٹ کے بُدھو گھر کو آئے۔

یہ خاکہ نامکمل رہے گا اگر اُس کے فارم ہاؤس کا ذکر نہ کیا جائے۔اُس نے کئی دنوں سے میرا سر کھا رکھا تھا کہ میں نے فارم ہاؤس بنایا ہے۔وہاں سبزیاں اور درخت لگائے ہیں۔میری بدقسمتی کہ ایک دن آزادمہدی کے پُرزور اصرار پر شاہدرہ چلا گیا۔بند کے کنارے پانچ، سات مرلے کا ایک گہرا سا پلاٹ تھا۔کچاپکا احاطہ تھا۔قریب قریب تمام پودے غذائی کمی کا شکار تھے اور درختوں کو پولیو ہو چکا تھا۔میں جن موسمی پھلوں اور سبزیوں کا تصور باندھ کر مونہہ میں پانی بھرے وہاں پہنچا تھا۔وہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔رستے میں آزادمہدی کے واقف تو بہت سے لوگ ملے مگر آزادمہدی نے انہیں کچھ کھلایا پلایا ہوتا تو وہ ہمیں بھی پوچھتے۔فارم ہاؤس میں تو کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا آزادمہدی نے مجھے ایک پھیری والے سے ایک کنواری مولی اور دونابالغ امرود لے کر کھلائے۔یہ تو ویسا ہی معاملہ تھا جو مچھلی کے اناڑی شکاری اپنی عزت بنانے کے لئے کرتے ہیں۔یعنی شکار میں تو ہاتھ کچھ نہیں آتا مجبوراً مچھلی منڈی سے مچھلی خرید کر گھر لاتے ہیں اور شکار کی کہہ کر کھاتے اور کھلاتے ہیں۔گھر والے بھی اتنے ذہین نہیں ہوتے جو یہ اعتراض کریں کہ بام مچھلی دریائے راوی میں کہاں سے آ گئی؟ قوم تو مستنصر حسین تارڑ سے بھی یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتی کہ دریائے راوی سینکڑوں میٹر گہرا کب اور کس مقام پر تھا؟ (ناول: ''راکھ'' پڑھنے والوں کی عظمت کو سلام)

پنجابی میں ایک محاورہ ہے: ''آنڈے کتھے تے گُڑگُڑ کتھے؟'' آزادمہدی بھی شاگرد تو سیف اللہ خالد کا ہے مگر گُن غلام حسین ساجد کے گاتا ہے اور انہیں کئی بار مائیکل جیکسن کی طرح کاسمیٹک سرجری کروا کر الطاف حسن قریشی بن جانے کا مشورہ دے چکا ہے۔الطاف حسن قریشی (اُردو ڈائجسٹ) وہی ہیں جنہیں جماعت اسلامی کی ''گوری میم'' یا ''چِٹی چوہی'' کہا جاتا ہے۔غلام حسین ساجد اور آزادمہدی دونوں ایک دوسرے کی ذہانت اور ٹیلنٹ کے اَز حد قائل ہیں مگر کوئی تیسرا اُن سے متفق نہیں۔یہی اُن کا المیہ ہے۔آزاد مہدی جس کا سپورٹر بنتا ہے اُسے لے ڈوبتا ہے۔ہمیشہ پیپلز پارٹی کو ووٹ ڈالتا ہے لہٰذا پارٹی شاہدرے سے کبھی جیتی نہیں۔حلقہ ارباب ذوق کے الیکشن میں غلام حسین ساجد کو سپورٹ کیا اور اُسے دوبارہ الیکشن لڑنے کے قابل نہ چھوڑا۔اقبال اکیڈمی میں اقبال سے بھی بڑے فلیکس غلام حسین ساجد کے لگائے گئے مگر لوگ اس بحث میں پڑے رہے کہ فلیکس پرنٹنگ فور کلر ہے یا سنگل کلر کیونکہ غلام حسین ساجد کے رُخِ انور سے کسی بھی کلر کی میچنگ یا آئیڈینٹیفکیشن نہیں ہو پا رہی تھی۔

وہ شاہدرہ پنڈ میں ایسی حسّاس اور پوشیدہ سی وضع رکھنے والی گلی میں رہتا ہے جس کا ڈایا گرام گائنی کے ہر طالب علم کو اَز بر کروایا جاتا ہے۔ اس گلی میں اکثر کوئی نہ کوئی کھڑا رہتا ہے یا کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آزاد مہدی نے عاجز آ کر وہاں پہلے فلیکس لگوایا: ''یہاں سائیکل کھڑی کرنا منع ہے'' تو محلے دار سائیکل کی بجائے موٹر سائیکل کھڑی کرنے لگے۔ جب موٹر سائیکل کے حوالے سے انتہا ہی فلیکس لگوایا تو ایک صاحب نے سکوٹر کھڑا کر دیا۔ اس پر آزاد مہدی نے حرفِ آخر کے طور پر یہ فلیکس لگوایا: ''یہاں کچھ بھی کھڑا کرنا منع ہے'' اس دن سے راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

آزاد مہدی نے لاہور ریلوے سٹیشن کی فضا میں ایک ناولٹ: ''اُس مسافر خانے میں'' بھی تحریر کیا مگر یہ اتنا مختصر ہے کہ لاہور ریلوے سٹیشن کے لوہے والے پل پر مرکزی سٹیشن سے چڑھتے ہوئے پڑھنا شروع کریں تو دوسری طرف چڑا منڈی کی طرف اُترتے اُترتے ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی تشنہ تحریر کا قاری اور بک سٹال والوں کو کیا فائدہ؟ یہ راز آزاد مہدی ہی بہتر جانتا ہے۔

اُس کی خوش لباسی درزیوں اور اعظم کلاتھ مارکیٹ کی محتاجی سے آزاد ہے۔ راہ چلتے زیب تن کرنے والی جو بھی چیز پسند آ جائے لے کر پہن لیتا ہے۔ فٹنگ، میچنگ، سٹیچنگ، ٹھنڈا، گرم کے چکر میں نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی لارنس گارڈن سے کوئی گرا پڑا پھول اُٹھا کر اپنی شرٹ کے ساتھ لف بھی کر لیتا ہے۔ بورڈ کے فارم پُر کرنے والے طالب علم ''لف'' لفظ سے بخوبی واقف ہوں گے اور مزا بھی لیں گے۔ بورڈ میں اپنی سیٹ پر امریش پوری بن کر بیٹھتا ہے۔ اس لئے کسی کو اس کے لباس پر اعتراض لگا کر اُتار دینے کا مشورہ دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر افسانہ نگار اعجاز فکر ال جیسا بے فکرا کچھ کہہ بھی دے تو بات کو دستوفسکی، گورکی اور ٹالسٹائی کی طرف لے جاتا ہے۔ پاکستان کے بعد اگلی بریک روس پر ہی لگاتا ہے۔

ایک بار آزاد مہدی کے دوستوں میں آزاد مہدی سے بڑھ کر جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوا جو راقم نے یہ کہہ کر جیت لیا: ''میں نے آزاد مہدی کو ایک ٹیکسی کے ساتھ ٹیکسی میں جاتے دیکھا'' اس جھوٹ کی سچائی یہ تھی کہ یہ روزانہ اپنی زوجہ محترمہ سے جو خرچی لے کر آتا ہے وہ اُسے حدود میں رکھتی ہے اور کسی عیاشی کے متعلق سوچنے ہی نہیں دیتی۔ رہی سہی آزادی وہ کمیٹی چھین لیتی ہے جو بورڈ میں چلتی ہی رہتی ہے۔ جس طرح بزدل لوگ مار دھاڑ اور قتل و غارت پر مبنی فلمیں دیکھ کر خود کو بہادر ظاہر کرتے ہیں اسی طرح یہ دوستوں کے رومانس کے واقعات پوری دلچسپی سے سُن کر اپنا ٹھرک پورا کر لیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ کھانے کے وقفے میں لارنس گارڈن (مجید نظامی گارڈن) جا کر مشکوک جوڑوں کو دیکھ کر اپنا رانجھا راضی کر لیتا ہے۔ اپنے حوالے سے اتنا کٹھور انسان بھی زمانے میں کم کم ہی ملے گا۔ یہاں یہ میرا جی کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ ہمارے ملنے والوں میں ایک صاحب ریلوے میں کام کرتے تھے۔ سفر فری تھا۔ جاتے ہوئے بیوی سے سفر خرچ کے نام پر جو ایک ہزار روپیہ لے کر جاتے تھے واپسی پر ایک ہزار دس روپے واپس کرتے تھے۔ پورا گھر حیران ہوتا تھا کہ پیسے کم ہونے کی بجائے زیادہ کیسے ہو گئے تو فخریہ طور پر بتاتے کہ رستے میں کہیں کھانے پینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور واپسی پر ٹرین میں 10 روپے کا نوٹ گرا ہوا ملا تھا اس طرح 1000 کے 1010 بن گئے۔ جب جھڈو پن کا یہ عالم ہو تو پھر گھر والے جو بھی کریں کم ہے۔

آزاد مہدی کو بھی شہرت کا ویسا ہی ہوکا ہے جیسا قتیل شفائی کو تھا۔ قتیل شفائی سرِ راہ پیشاب بھی کرتے تھے تو پیشاب کی دھار

سے دیوار پر لکھتے تھے: ''یہ پیشاب قتیل شفائی نے کیا ہے''

آزاد مہدی کے ناول ''دلاّل'' کا دوسرا ایڈیشن ''اپنا ادارہ'' سے عظیم اقبال شائع کرنے جا رہا تھا۔ دونوں نے اس ضمن میں مجھ سے پبلسٹی کے بارے میں مشورہ کیا۔ مجھے شرارت سوجھی میں نے عظیم اقبال سے وعدہ کرلیا کہ ''دلاّل'' کے بارے میں شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی رائے منگوادوں گا۔ میں نے اصل میں کیا، کیا تھا اس کی تفصیل آپ کو بتاتا ہوں۔

آزاد مہدی کا اصرار تھا کہ تاثرات کے نیچے دستخط اور تاریخ بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اُسے غالباً کسی گُرگ جہاں دیدہ نے یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ میں تمام رائٹرز کے دستخط پہچانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دونمبری نہ ہوجائے۔ لہٰذا ہر ملاقات میں آزاد مہدی کی تان دستخطوں پر ہی ٹوٹتی۔ میرے پاس شوکت صدیقی کے کئی خطوط موجود تھے اس لئے کہ انہوں نے مجھ پر شفقت فرمائی اور میں اُن کی خدمت میں کراچی جا کر حاضری بھی دیتا رہا۔ مشکل اگر تھی تو قرۃ العین حیدر کے دستخطوں کی۔ مجھے یقین تھا کہ مطلوبہ دستخط ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب: ''اُردو افسانے کی روایت'' سے باآسانی مل جائیں گے۔ تلاش بسیار کے بعد پنجاب پبلک لائبریری سے وہ کتاب ڈھونڈ نکالی اور بڑے سکون سے قرۃ العین حیدر سے متعلق گوشہ کھولا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں دنیا جہاں کے افسانہ نگاروں کے دستخط تو موجود تھے اگر نہیں تھے تو قرۃ العین حیدر کے۔ اب میری مشکل سوا ہوگئی۔ اِدھر سے عظیم اقبال کے فون پر فون آرہے تھے۔ بہت سوچا کیا کروں۔ ایک شام ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے فون پر وقت لے کر اُن کے گھر پہنچا اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ قرۃ العین حیدر کے دستخط ہی اس کتاب میں کیوں موجود نہیں؟ ویسے تو کیوں پر اکثر لڑائی ہوجاتی ہے مگر مرزا صاحب نے مجھے بتایا کہ کتاب مرتب ہونے تک قرۃ العین حیدر سے رابطہ نہیں ہو پایا اور 1991ء میں جب کتاب شائع ہوگئی تو قرۃ العین حیدر کو لکھے گئے مکتوب کے جواب میں اُن کا خط لندن سے آیا۔ وہ اُن دنوں لندن میں تھیں۔ اب اُس خط کی ڈُھنڈیا پٹی اور جب تک ڈاکٹر صاحب نے اپنی فائلوں میں سے وہ خط ڈھونڈ نہیں نکالا میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ کس قدر بے چین تھا بتا نہیں سکتا۔ عین اس وقت عظیم اقبال کا فون پھر آیا اور اس وقت میں کھل اٹھا جب قرۃ العین حیدر کا مرزا صاحب کے نام لکھا گیا خط میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُن سے مکتوب کی فوٹو کاپی کروانے کی اجازت چاہی۔ فوٹو سٹیٹ مشین تک گیا۔ اُنہیں مکتوب واپس کر کے جب گھر آیا تو اپنے ہاتھ سے قدرے خوش خط بنا کر لکھی گئی قرۃ العین حیدر کی تحریر کے نیچے وہ دستخط ثبت کر دیئے۔ اب اگلا مرحلہ ان دونوں آراء کو عظیم اقبال تک پہنچانے کا تھا اور یہ کام میں بڑی آسانی سے خود جا کر، کر سکتا تھا۔ لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ دونوں آراء میں نے عظیم اقبال کو FAX کر دیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ فیکس سے نکلی تحریر محض چند دنوں کی مہمان ہوتی ہے۔ یوں نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔ رائٹر اور پبلشر دونوں جلدی میں تھے جب ناول ''دلاّل'' شائع ہوگیا تو ناول سے متعلق ''چوپال'' میں ہونے والی تقریب کے موقع پر میں نے اپنے چند دوستوں کی مدد سے یہ سارا قصہ ہینڈ بلز کی صورت میں تقسیم کروادیا۔

عظیم اقبال اور آزاد مہدی سے لوگ وضاحت طلب کرتے تھے اور وہ انتہائی ڈھٹائی سے یہ جواب دیتے تھے کہ اصل تحریر ہمارے پاس موجود ہے۔ ان دونوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ جب اس فیکس کو فائل میں سے نکال کر بغور دیکھا گیا تو وہ کلین شیو تھی۔

فلیپ سکینڈل کا نتیجہ کیا نکلا؟

- آزادمہدی انڈر گراؤنڈ ہو گیا
- غلام حسین ساجد نے ملتان کی راہ لی
- اور عظیم اقبال کراچی بھاگ گیا

کئی ہفتوں بعد جب حالات نارمل اور آفٹر شاکس ختم ہوئے تو یہ حضرات اپنی پردہ پوشی ختم کرتے ہوئے منظر عام پر نمودار ہوئے۔ اس دن سے لے کر آج تک یہ تینوں حضرات میرا از حد احترام کرتے ہیں اور قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی کے ساتھ ساتھ میری بھی اُتنی ہی عزت کرتے ہیں۔

آزادمہدی کی یہ خوبی تو ماننی پڑے گی کہ وہ اس لیٹر بم بلاسٹ کے بعد خود میرے بنک میں آیا جب کہ مجھے بنکر میں ہونا چاہیے تھا لیکن اُس نے سب کچھ بھلا کر مجھے سینے سے لگا لیا ورنہ میں تو خود کش حملے کی توقع رکھے ہوئے تھا۔ دنیا ختم تو نہیں ہو گئی تھی۔ جو سبق میں آزادمہدی کو دینا چاہتا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ بڑی ادبی شخصیات کے فلیپ اور دیباچے کسی جونیئر رائٹر کا سہارا نہیں بنتے۔ میری اس سوچ کی تصدیق سیف اللہ خالد کی کتاب ''دیباچے سے فلیپ تک'' نے بھی کی جس میں اس حوالے سے بہت کچھ موجود ہے۔ عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور احمق کے لئے BATA کی پوری دکان بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے!

عہد ساز......عمران خان

عمران خان پر خاکہ لکھنے کا خیال ایک عرصے سے تھا۔عمران خان کو تو میں اپنا پہلا ناول:''غازہ خور''(1995) لکھتے وقت بھی نہیں بھولا تھا جو میری 15 سال کی محنت تھی۔میرے ناول میں کرکٹ ورلڈ کپ کا ذکر یوں تو 489 سے 526 صفحات کے درمیان موجود ہے مگر اُس میں سے عمران خان اور کرکٹ کے حوالے سے کچھ جملے اور پیرے قارئین کو ضرور پسند آئیں گے:''قوم ہمارے لیے دُعا کرے لیکن زیادہ امیدیں وابستہ نہ کرے'' یہ حقیقت پسندانہ بیان تھا عمران خان کا ورلڈ کپ 1992 کے حوالے سے۔لیکن ورلڈ کپ سیمی فائنل میں پہنچتے ساتھ ہی ہندوستان والے بھی پاکستان کی حمایت میں نظر آنے لگے۔ہندوستان کے عظیم کرکٹر سنیل گواسکر (ورلڈ کپ کے آفیشل مبصر) نے پاکستان کے فائنل جیتنے کی بھی پیش گوئی کر دی کیونکہ اس ورلڈ کپ میں سب سے بڑا دھما کہ پاکستان نے ہی کیا تھا جو پوائنٹس ٹیبل کے تالاب کی تہہ میں سے اپنی حریف اور بہتر ٹیموں میں سب سے نیچے رہتے ہوئے کسی ڈولفن جیسی بازی گری دکھاتے ہوئے سطح آب سے اُوپر شاندار انداز میں لہرائی تھی۔جب انضمام الحق (دوائیوں کے زیر اثر جواُسے بیماری کے باعث دی گئیں تھیں) جھومتا جھامتا گراؤنڈ میں داخل ہوا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ میچ کا نقشہ بدلنے جا رہا ہے۔مارٹن کرو(نیوزی لینڈ ٹیم کا کپتان) بڑے مزے سے اپنے سامنے والی کرسی پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔اُس کے (اور گراؤنڈ میں موجود ہر فرد کے) خیال میں نیوزی لینڈ کا سکور جیت کے لیے بہت کافی تھا لیکن جب ملتانی ملنگ (انضمام الحق) نے قصائی کی طرح مار دھاڑ شروع کی تو مارٹن کرو بھی اپنی پھیلی ٹانگیں سمیٹنے پر مجبور ہو گیا اور یہ میچ جو ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ پاکستان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو گا پاکستان نے ایک اوور پہلے ہی جیت کر فائنل کے لیے کوالیفائی کر لیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ وہی سانحہ پیش آیا جو اس سے قبل 1987 میں پاکستان کو لاہور میں آسٹریلیا کے ساتھ ورلڈ کپ سیمی فائنل کھیلتے ہوئے پیش آیا تھا۔تاریخ نے خود کو دُھرایا تھا۔وہ پہاڑ کی چوٹی سے چاند کے مدار میں داخل ہونے کی تمنا لیے ہوئے، کھائی میں جا گرے تھے اور ماضی کی طرح اس بار بھی میزبانوں کے لیے یہ کپ جیتنے کا خواب اُدھورا ہی رہا۔

فائنل کے لیے پوری قوم ''اُمید سے تھی'' اور سب اس طرح خوش تھے جیسے انہوں نے ورلڈ کپ کا ULTRA SOUND دیکھ رکھا ہو۔اگر پاکستانی مذہباً مسلمان نہ ہوتے تو عمران دیوتا کا بُت کبھی کا بن چکا ہوتا لیکن عمران خان کے بُت نہ ہونے کے باوجود پُوجا کی جاتی تھی۔اُس کی تصویر کسی لیڈر کی تصویر سے زیادہ بکتی تھی اور اُس کی سب سے بڑی انفرادیت یہ تھی کہ پاکستان سے نفرت کرنے والے بھی (بالخصوص ہندوستان والے) اُس سے پیار کرتے تھے۔فائنل میں ملتانی ملنگ (انضمام الحق) پھر کام آ گیا اُس نے چیونگم چباتے چباتے انگلینڈ کو چباڈالا۔وسیم اکرم نے اپنی تمام تر توانائیاں اس فائنل کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔پہلے گوریلا ایان بوتھم اُس کا شکار بنا اور غراتا ہُوا واپس پویلین لوٹ گیا۔پھر مشتاق احمد نے گریم ہک کو ستانا شروع کیا اور اُسے ون ڈے، ٹیسٹ میچ کے انداز سے کھیلنے پر مجبور ہونا پڑا۔مشتاق کی گیندوں کی ورائٹی کی وجہ سے وہ کبھی مشتاق کو، کبھی گیند کو اور کبھی خود کو دیکھ رہا تھا۔لیمب اور فیئر برادر

کی پارٹنرشپ میچ کی سب سے خطرناک پارٹنرشپ تھی جسے وسیم اکرم کی ABSOLUTELY WORLD CLASS گیندوں نے توڑ دیا۔ میچ کے اختتام پر انگلینڈ کو وہی 22 کا فگر دوبارہ دیکھنے کو ملا جو جنوبی افریقہ کے خلاف اُن کے سیمی فائنل کے اختتام پر جگمگایا تھا۔ وہاں وہ بارش کے متنازعہ قانون سے جیتے تھے آج وہ اچھے کھیل سے ہارے تھے۔ ورلڈ کپ صرف اور صرف عمران خان کی اعلیٰ قیادت کا پھل تھا ورنہ آدھی، پونی ٹیم سے ورلڈ کپ جیتنے کی توقع رکھنا ایک مذاق ہی کہا جا سکتا تھا۔ عمران خان نے شاید ہی کوئی میچ پُرفارمنس کے بغیر کھیلا ہو۔ کبھی باؤلنگ، کبھی بیٹنگ اور کبھی کپتانی۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا اُس کی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورِ اقتدار میں جو واحد اچھا کام کیا وہ عمران خان کو ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کرنا تھا۔ ایسا کام کسی DICTATOR کے لیے تو آسان ہو سکتا ہے کسی جمہوری حکمران کے لیے نہیں۔

ورلڈ کپ کی فاتح ٹیم کا استقبال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے استقبال کی (انتظامیہ کی مدد، طاقت کے استعمال اور سرکاری ٹرانسپورٹ کی فراہمی کے بغیر) صدر اور وزیراعظم صرف حسرت ہی کر سکتے ہیں مگر یہ استقبال ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے والی مثال اسی جلوس پر صادق آتی تھی۔ ایئرپورٹ سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ہی راستے ہجوم کی وجہ سے بند تھے۔ کوئی گاڑی آگے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں کی کھڑی گاڑیوں پر جوشیلے نوجوان چڑھ گئے اور گاڑیوں میں ڈینٹ پڑ گئے مگر گاڑی مالکان کے ماتھوں پر شکن تک نہیں آئی تھی کیونکہ یہ پورے پاکستان کی مشترکہ خوشی تھی اور ایسی خوشی روز روز نہیں ملتی۔

ایئرپورٹ کے راستے میں موجود بیشتر کوٹھیوں سے خواتین، بچے، بوڑھے کھلاڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھے اور ٹیم کو لیے ہوئے ٹرک جیسے ہی باہر آیا تو اُسے جگہ جگہ روک کر نوجوانوں نے خوشی سے رقص کیا اور نوٹ نچھاور کیے۔ پھولوں کی بے شمار پتیوں کے ساتھ ساتھ بغیر سائلنسر موٹرسائیکلوں کا شور اور دھواں، گاڑیوں کے ہارنوں کی آواز اور بلند آواز میں ملّی نغمے اور ترانے سب اس ماحول کا حصہ تھے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد پوری مال روڈ پر جانے کب سے کھڑی عمران خان اور اس کے جان لڑا دینے والے ساتھیوں کی راہ تک رہی تھی اور جوشیلے لڑکے جو موٹرسائیکلوں پر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے لوگوں کو لمحہ بہ لمحہ صورت حال سے آگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اُس وقت لالچی اور بلیک میلرز ٹی وی چینلز کا کوئی وجود نہ تھا جو تھوک کے حساب سے مشرف نے اپنے دورِ اقتدار میں CNG سٹیشنز کی طرح جنے تھے۔ پوری دنیا میں ٹی وی چینلز کی کثیر تعداد کے حوالے سے پاکستان واحد مثال ہے۔ جنرل مشرف کے خیال میں ٹی وی کے اینکر پرسنز اصل میں عوامی نمائندے تھے، اسمبلی محض نام کی اور حرام کی تھی۔ چینلز کا اصل مقصد عوام کو بھانت بھانت کی بولیاں سنا کر ''سچ'' سے دور رکھنا ہے۔

ورلڈ کپ فاتح ٹیم کا جلوس، داتا دربار تک گیا۔ ٹیم کے اعزاز میں دعوتوں اور انعامات کا سلسلہ جاری تھا اور پوری قوم اپنے ان سفیروں پر محبتیں نچھاور کر رہی تھی۔ اس ورلڈ کپ کی جیت نے عمران خان کے کینسر ہسپتال کے لیے مالی دشواریاں دور کرنے میں بھی خاصی مدد کی تھی۔ جو لوگ عمران خان کو کرکٹ سے آؤٹ سمجھ کر امداد دینے سے ہاتھ روک بیٹھے تھے، اُن میں بھی ایک نیا جذبہ عود کر آیا تھا۔ عمران خان کے اعزاز میں لاہور کالج (موجودہ یونیورسٹی) برائے خواتین، جیل روڈ، لاہور میں ایک تقریب تھی۔ عمران خان کے آنے کا انتظار ہو رہا تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں لیکچرر اور پروفیسرز بھی بناؤ سنگھار میں مصروف

تھیں۔ اگر ماحول کالج کا نہ ہوتا تو بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بارات کا استقبال ہو۔ عمران خان کو کسی اور جگہ فنکشن اٹینڈ کر کے آنا تھا اس لیے خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن اس تاخیر کی وجہ سے رش کم ہونے کی بجائے اُلٹا بڑھ گیا تھا۔ عمران خان کے آتے ہی دھما چوکڑی مچ گئی۔ تقریر کسی نے سُنی کسی نے نہ سُنی اور چائے کے سامان کا تو وہ حشر ہوا جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عمران خان کو KISS کرنے کی شرطیں کئی لڑکیوں نے لگا رکھی تھیں۔ عمران خان پر لڑکیاں شرطوں کے مطابق ٹوٹ پڑیں۔ کالج کی سدابہار پرنسپل بشریٰ متین بھی متانت کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ عمران خان کو سنبھالتے سنبھالتے کئی افسران خود گر گئے۔ عمران خان بمشکل اپنی کار تک پہنچے اور واپسی کی راہ لی۔

عمران خان دوسروں سے کتنا مختلف ہے اس کا اندازہ مجھے 1987 کے ورلڈ کپ کے دوران پیکیجز کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کرتے ہوئے ہوا۔ جاوید میانداد جیسا بڑا کرکٹر پیکیجز کے مرکزی دفتر صرف پانچ ہزار کا چیک وصول کرنے WILLS سگریٹ کمپنی کے سوزوکی ڈبے میں پہنچا۔ دیگر کرکٹر بھی ایسے ہی چیک لینے آئے۔ عمران خان کا AMERICANEXPRESS BANK والا VOUCHER CHEQUE مجھے تین بار بنانا پڑا۔ چیک کی رقم 5000 سے 10000 ہوئی اور پھر 15000 تک کر دی گئی اور پیکیجز کا نمائندہ یہ چیک وصول کروانے کے لیے عمران خان کے گھر بیٹھا انتظار کرتا رہا مگر عمران خان نے ان چیکوں کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھتے ہوئے وصول نہ کیا اور پیکیجز کو یہ چیک CANCEL کرنا پڑے۔ عمران خان کو دیکھنے کی خاطر لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں کئی میچ ایک خاص طریقے سے سٹیڈیم میں مفت داخل ہو کر بھی میں نے دیکھے۔ اُس وقت قذافی سٹیڈیم ایک قلعہ بند عمارت جیسا نہیں ہوا کرتا تھا۔ عمران خان سے ہاتھ بھی ملایا جو بہت بھاری تھا۔ عمران خان کو ڈریسنگ روم میں گلوکوز کا پورا ڈبہ گھول کر پیتے بھی دیکھا اور پورا چرغہ چار لقموں کی صورت میں معدے تک پہنچاتے بھی۔ اُس کی مثالی فٹنس جو اچھی خوراک اور زوردار ورزش سے مشروط ہے آج بھی اُس کے ہم عمروں کو حیران کر دیتی ہے۔ عمران خان نے TALENTED لوگوں کو پہچاننے میں بہت کم غلطی کی ہے۔ کرکٹ میں اُس کی غلطی کرکٹر منصور اختر اور سیاست میں ہر سیاسی پارٹی کو سونگھ کر چھوڑ دینے والا جاوید ہاشمی تھا۔ جاوید ہاشمی کے بارے میں عمران خان کو شاید کسی نے یہ نہیں بتایا کہ یہ وہی شخص تھا جو اپنے زمانۂ طالب علمی میں پنجاب یونی ورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر ہونے کے نشے میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے V.C ڈاکٹر محمد اجمل کو اُن کی ٹائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا سینٹ ہال تک لایا۔ اپنے اُستاد کے ساتھ ایسا بدترین سلوک کرنے والا جب خود جیل گیا تو لوگوں کی ہمدردیوں کا منتظر رہا!

سینئر اور تجربہ کار افراد پر نئے ادارے یا سیاسی جماعت کی لازمی ضرورت ہوا کرتے ہیں مگر عبوری دور تک۔ میں نے بھی جب 1992 میں دی بنک آف پنجاب جوائن کیا تو وہاں خاصی تعداد نیشنل بنک آف پاکستان کے تجربہ کار افسروں کی تھی لیکن جب انہوں نے دی بنک آف پنجاب کے نئے گریڈ تھری افسروں کو ٹرینڈ کر دیا تو نیشنل بنک آف پاکستان یا دیگر بنکوں سے آئے ہوئے سینئر افسران رفتہ رفتہ فارغ کر دیئے گئے۔ اب دی بنک آف پنجاب میں غالب اکثریت نئے افسران کی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ سینئر ہو چکے ہیں۔

عمران خان کی پاکستان تحریک انصاف (PTI) بھی عبوری دور سے گزر چکی ہے۔ اب ''ہاشمی سُرمہ'' (المعروف ''داغی'') اور

دیگر چلے ہوئے کارتوس PTI کی ضرورت نہیں رہے بلکہ ناجائز بوجھ اور خطرہ ہیں۔ ایسے لوگ بہ امر مجبوری انتظامی سطح پر پردے کے پیچھے مشیر تو رکھے جاسکتے ہیں مگر ان کا ٹکٹ ہولڈر ہونا اب پارٹی کے حق میں نہیں۔ پاکستان تحریک انصاف کے اندر کے لوگ بتاتے ہیں کہ پارٹی کے اندر جاوید ہاشمی کی حیثیت انعامی بانڈز کے نمبر بتانے والے مجذوب بابے جیسی تھی۔ کبھی اُن کا بتایا ہوا نمبر لگ جاتا کبھی نہ لگتا۔

دھرنے نے دھاک بٹھا دی ہے حریفوں پر۔ پارٹی عوام سے ROOTS LEVEL پر ہمکلام ہو چکی ہے۔ جب عوام کسی پارٹی کو ووٹ دینے کے حق میں ہو جاتے ہیں تو امیدواروں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے اور وہ بھی پارٹی وفاداری کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ اگر پارٹی اس کے برعکس WINNING HORSES پر انحصار کرتی ہے تو وہ پارٹی کو بلیک میل کرنے لگتے ہیں اور پارٹی کی اُس وقت تک عزت کرتے ہیں جب تک وہ بے عزت نہیں ہو جاتی۔

عمران خان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ رہا ہے اور کوئی غلطی دُہرا نہیں رہا جبکہ اُس کے حریف اپنے ذہنی ویلوڈرم میں دوڑ تو بہت لگا رہے ہیں مگر VISION سے محرومی انہیں ایک حد سے آگے نہیں جانے دے رہی۔ شریف فیملی کا دھرنے کے دوران زرداری کو SOS کال دینا، مریم نواز کا انکل زرداری کے لیے زیتون کے تیل میں پاوے پکانا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ عوام تو عوام، زرداری کے بارے میں بھی ٹھیک سے نہیں جانتے تھے کہ انہیں بھنڈی بھجیا بہت پسند ہے اور وہ گوشت خور نہیں، ویجیٹیرین ہیں بقول سرکاری میراثی قاسمی: ''ایک کھانے پینے کا شوقین بادشاہ اپنے ہمسایہ ممالک میں انتہائی احمق مشہور تھا جس کی وجہ سے لوگ اُس کے ملک کا دورہ کرنے سے کتراتے تھے اور عوام کی بھی کوئی خاص عزت نہ تھی۔ بیوقوف بادشاہ کو اس صورت حال کا ادراک کر کے بہت دُکھ ہوا اور اُس نے اپنے تمام چمچوں کڑچھوں کو بلا کر سختی سے تاکید کی کہ ملک کا امیج بہتر کرنے کی بہت شدت سے ضرورت ہے ورنہ اگر دوسرے بادشاہوں نے آنا بند کر دیا تو ہم دنیا میں تنہا رہ جائیں گے اور ہماری ذِلت میں مزید اضافہ ہوگا، سب نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ اس مرتبہ کوئی حماقت نہیں ہوگی آپ بے فکر ہو کر کسی بادشاہ کو دورے پر بلائیں۔ ایک بادشاہ کو بہلا پھسلا کر دورہ کرنے پر رضامند کیا گیا۔ مہمان بادشاہ کا پورا دورہ خیر خیریت سے گزرا کوئی حماقت نہ ہوئی۔ سبھی اپنی اپنی جگہ خوش اور مسرور تھے۔

ہمسایہ ملک کے بادشاہ کو کامیاب دورے کے بعد رخصت کرتے ہی بادشاہ نے اجلاس طلب کیا۔ سب نے ''سب اچھا'' کی رپورٹ دی صرف ہیڈ باورچی ایک کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُس سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے باورچی نے جان کی امان پاتے ہوئے بتایا کہ اُس سے ایک بیوقوفی ہوگئی۔ وہ مہمان بادشاہ کے الوداعی ظہرانے میں پیش کیے گئے سالن میں گرم مصالحہ ڈالنا بھول گیا تھا۔ بادشاہ سمیت سب نے سر پکڑ لیا اور اس حماقت پر سخت آزردہ ہوئے۔ بادشاہ نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ اپنی فوج کے تیز رفتار ترین گھڑ سواروں کا دستہ بلایا اور انہیں پسے ہوئے گرم مصالحے کی تھیلیاں دے کر مہمان بادشاہ کے تعاقب میں روانہ کیا کہ وہ جہاں ملیں اُنہیں چٹکی بھر گرم مصالحہ فی کس کھلا دو۔ تیز رفتار دستے نے ایسا ہی کیا۔ مہمان بادشاہ اور اس کے ساتھی جو میزبان بادشاہ اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی دانست میں ذہین قرار دے چکے تھے ایک بار پھر اس حرکت کے باعث اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

اگر نواز شریف کو بھی بروقت پتہ چل جاتا کہ زرداری بھنڈی کی بھجیا بڑے شوق سے کھاتے ہیں تو وہ زرداری کے جانے کے

بعد بذریعہ کوریئر بھنڈی کی بھُجیا زرداری ہاؤس بھجوا دیتے اور اپنے احمق ہونے کا تاثر جوزیتون کے تیل میں پاوے پکانے سے پیدا ہوا تھا بروقت زائل کر دیتے۔ زرداری ہاؤس وہاں سے کون سا دور تھا۔ رائے ونڈ محل کے عقب ہی میں تو واقع تھا۔

ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانے والا محاورہ سنا تو تھا مگر پکچرائز ہوتے رائے ونڈ محل (جاتی عمرہ المعروف بستی لوہاراں) میں دیکھا۔ عطاء الحق قاسمی اس ملاقات کے حوالے سے جو لطیفے الحمراء میں بیٹھ کر سناتا ہے وہ سننے والے کو ہنسانے کی بجائے رُلا دیتے ہیں کیونکہ یہ قومی زوال کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لطیفے سناتے وقت قاسمی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے مجسمے پر کپڑا ڈالنا بھول جاتا ہے جو الحمراء کے لان میں ہر آنے جانے والے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔

عمران خان کی یہ کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہیں کہ وہ نواز شریف جو 99 کے چکر میں رہا کرتا تھا اب ABC پڑھنے لگا ہے مگر اُس کی ABC عین چوک یعنی D پر آ کر رُک جاتی ہے۔ اُسے اپنے پورے خاندان کے بے روزگار ہونے کا غم کھائے جا رہا ہے۔ سیلاب والی دیہاڑی بھی دھرنے پر نظر رکھنے کے باعث ٹھیک سے نہیں لگی۔ پیشہ ور مُلّا ،لیگیوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ امدادی سامان کے بھرے ہوئے ٹرک لے کر سیلاب زدہ علاقوں میں گئے اور واپسی پر بکرے، چھترے، دُنبے اور گائے اونے پونے دھونس دھاندلی سے خرید کر انہی امدادی ٹرکوں میں بھر لائے اور عیدالاضحیٰ جو سیلاب سے کچھ ہی دیر بعد آئی تھی، مہنگے داموں فروخت کر کے ثواب بھی کمایا اور پورے سال کا راشن بھی اُس لُوٹ کے مال سے اپنے گھروں میں ڈال لیا۔ سیلاب زدگان نے یہ جانور پورا سال پالے تھے عیدالاضحیٰ پر فروخت ہونے کی امید پر مگر اُن کے ساتھ ہوا کیا؟ اس لیے عمران خان کا کہنا ہے کہ انصاف ہر سطح پر پاکستان کی حقیقی ترقی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ ناانصافی پر مبنی معاشرے مٹ گئے باقی وہی رہے جنہوں نے انصاف کو اپنی پوری رُوح کے ساتھ ہر سطح پر رواج دیا۔ عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری نے D چوک اسلام آباد میں اوپن ایئر عید منا کر پاکستانی سیاسی تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کی۔

جمہوریت ہمیں صرف مغربی ممالک میں ہر سطح پر محسوس ہوتی ہے اور صفائی جیسا نصف ایمان بھی۔ مسلم ممالک ابھی تک بادشاہت کے اثر سے نہیں نکل پائے۔ امریکی صدر جمی کارٹر اپنے نام کے ساتھ ''کارٹر'' CARTER (گاڑی بان) فخریہ طور پر لکھتا ہے مگر پاکستانی وزیراعظم کو نواز شریف لوہار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی شرمندگی کو مٹانے کے لیے G.C یونیورسٹی سے ''ڈاکٹر'' پلس ''حکیم'' کی اعزازی ڈگری یونیورسٹی کو سات ارب روپے کی گرانٹ دے کر ''ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو'' کے اصول پر حاصل کی گئی۔ شریف خاندان کے ساتھ معاملہ ''کریلا نیم چڑھا'' والا ہوا۔ دماغ میں تکبر اور خنّاس پہلے ہی سے تھا، رہی سہی کسر سعودی عرب میں قیام نے پوری کر دی۔ سعودی شاہی خاندان ''خادم الحرمین'' تو پہلے ہی سے تھا ''شریفین'' شریف خاندان کی میزبانی کے بعد ہو گیا۔ ہمارے پاکستانی حکمران ملک کا مستقبل بدلنے کی بجائے اپنا ماضی بدلنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ انڈیا کے صدر گیانی ذیل سنگھ سے جب نواز شریف کا تعارف جنرل ضیاء کروانے لگا تو اُس نے کہا: ''ایناں دے تعارف دی کوئی لوڑ نئیں میں جاناں واں اے شریف لوہار دا پتر اے'' شریف خاندان خود کو دینی اور دنیاوی دونوں سطح پر کامیاب و کامران سمجھتا ہے وہ کسی اور کو خاطر میں کیونکر لائے گا؟ مگر وقت کا چلتا پہیہ ہر کسی کی ایسی غلط فہمی دور کر دیتا ہے۔ تبدیلی اور ارتقاء کے عمل کو سست تو کیا جا سکتا ہے، روکا کبھی نہیں جا سکتا۔ عمران خان اندر

باہر سے مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔ پاکستان میں تبدیلی اگرچہ بہت مشکل کام ہے مگر وہ ہمیشہ سے مشکل پسند رہا ہے۔ اعجاز الحق، جرنیل کا بیٹا ہوکر بھی تھانے میں ایک رات کھٹملوں کے ساتھ اور بیوی کے بغیر نہیں گذار سکا تھا اور اصلی کلاشنکوف کو کھلونا بندوق (جو اُس کے سُسر جنرل رحیم الدین گورنر بلوچستان نے تھانے میں بھجوائی تھی) سے تبدیل کر کے گھر بھاگ گیا تھا۔ مگر عمران خان ہر تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نہ خود بھاگے گا نہ کسی کو بھاگنے دے گا، مقابلے کے منطقی انجام تک۔ اُس کی ساری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے اُسے کرکٹ کا پہلا ٹیسٹ میچ کھیل کر ایک طویل وقفے سے دوبارہ کرکٹ میں آنے کا موقع ملا۔ کرکٹ میں اپنے عروج پر وہ ٹانگ کے فریکچر کا شکار ہوگیا اور آدھا عمران خان رہ گیا مگر اُس نے وہ بُرا وقت بھی صبر و استقامت سے گذار لیا۔ بعد میں اللہ نے اُس کے نصیب میں کرکٹ ورلڈ کپ، شوکت خانم کینسر ہسپتال، نمل یونیورسٹی اور پاکستان تحریک انصاف جیسی بڑی کامیابیاں لکھی تھیں اور کامیابیوں کا یہ سفر ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔ عمران خان پاکستان کو باعمل، پُرعزم، تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوانوں کی ایک ایسی ٹیم دے کر جائے گا جس کا میدانِ عمل پورا پاکستان ہوگا۔

اسلام کے ماے

جس ملک کی آبادی 90% مسلمان ہو اور ملک کا نام بھی ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہو اگر وہاں اسلام خطرے میں ہوگا تو پھر وہ بخیر و عافیت کہاں رہتا ہوگا؟ اس سوال کا جواب آپ کو اسلام کے ماے ہی دے سکتے ہیں۔ کسی ذی شعور سے اس سوال کے جواب کی توقع رکھنا وہ بھی کار کے انعام کے بغیر، ناممکن سی بات ہے۔ اسلام کے ماے مولانا مودودی سے یہ بھی پوچھا جائے کہ آپ حیدرآباد (دکن) ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان آئے تھے اور اسلامیہ کالج لاہور میں ادیان پڑھانے کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام کے ہاتھوں سے اسلامیہ کالج چھیننے کی کوشش کی تو نکال باہر کیے گئے۔ اسلام ہندوستان میں خطرے میں تھا یا پاکستان میں؟ جہاں خطرہ زیادہ تھا وہاں آپ کیوں نہیں رہے؟ پاکستان میں آنے کی ان ماموں کو اس قدر خوشی تھی کہ ہندوستان میں اپنی مذہبی دکانیں، جہاں ہے جیسی ہے کی بنیاد پر کھلی چھوڑ آئے تھے۔ کیا ہندوستان میں مسلمان سرے سے ختم ہو گئے تھے؟ انہیں ان ماموں کی رہنمائی اور سرپرستی کی ضرورت نہیں تھی؟ بقول اقبال:

دینِ کافر فکر و تدبیر و جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

پاکستان کی طرف سونے کی کان سمجھ کر بھاگنے والوں کی سوچ کاروباری اور مفاداتی تھی۔ اسلام کی محبت کا صرف ڈراما تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کسی بھی بڑی سیاسی یا مذہبی جماعت نے ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کو ہندوستان ہی میں کسی ایک صوبے میں اکٹھا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انہیں اُس بس کے مسافروں کی طرح تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جس کا ڈرائیور متوقع حادثے کا یقین کر لینے کے بعد بس سے چھلانگ لگا چکا ہو اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد پاکستانیوں کو نصیحتیں کرتے رہے، ڈراوے دیتے رہے مگر ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت نہ سنبھالی۔ اقبال فرماتے ہیں:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مسلمانوں کے ہندوستان میں ایک نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے ساتھ جو، جو ناانصافیاں ہوئیں انہوں نے ایک ہندو رائٹر کنہیالال گابا کے ذہن پر اس قدر گہرے اثرات مرتب کیے کہ وہ مسلمان ہو گیا اور اپنا اسلام نام K.L.GABA رکھا۔ اُس کی انگلش کتاب کا ترجمہ: ''مجبور آوازیں'' کے نام سے 70 کی دہائی میں، اندرا گاندھی کے دور میں شائع ہوا تو دنیا کو پتہ چلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ اسلام کے ماے بدستور حلوہ کھانے میں مصروف رہے اور کھالوں کی کمائی والا حساب گڑبڑ نہ ہونے دیا۔ مُلّا کو آپ نے ہمیشہ لیتے ہی دیکھا ہوگا دیتے ہوئے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ اسلام نے بھیک مانگنا کہاں سکھایا تھا جو آج مسلمان اس کام میں سب سے آگے ہیں؟ سکھ قوم دنیا کی واحد قوم ہیں جس میں ایک بھی بھکاری نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نصابی سطح پر ''دینیات'' پڑھائی جاتی تھی جو تمام ادیان کے مختصر معلوماتی مطالعے پر مشتمل ہوتی تھی اسے مولانا مودودی نے ''اسلامیات'' سے تبدیل کروا کر ہماری سوچ پر لوہے والی اسلامی ٹوپی پہنا دی جس سے ساری پاکستانی قوم (مغربی پاکستان کی حد تک) دولے شاہ کے چوہوں میں تبدیل ہوگئی۔ بنگالیوں نے یہ ٹوپی نہیں پہنی اور تنگ نظری سے بچے رہے۔ یہی معاملہ نصابی سطح پر تاریخ عالم اور جغرافیہ کے ساتھ بھی ہوا جسے 'مطالعہ پاکستان'' میں بدل دیا گیا۔ کیا اس طرح پاکستان قوم کا I.Q بڑھا؟

مولانا مودودی کی محدود سوچ کے باعث ایک طبقہ انہیں ''مولانا محدودی'' بھی کہتا رہا۔ آخر انہیں ''کافر اعظم'' کہنے کا جواب کہیں نہ کہیں تو ملنا ہی تھا ناں۔ دہلی یونیورسٹی میں جماعت اسلامی کا زیر لب نام لینے والے مسلمان پروفیسر سرکاری رہائش گاہوں کو چھوڑ کر علیحدہ رہتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی دانست میں اسلام خطرے میں نظر آتا ہے۔ ایک مثال: پروفیسر ڈاکٹر ابن کنول۔

پاکستان بننے سے کچھ عرصہ بعد یہاں کی سُن گُن لے کر مولانا مودودی کی لاہور آمد ہوئی مگر اُن سے بھی پہلے ''انجمن مدرسۃ البنات'' والے مولانا عبدالحق عباس صاحب لیک روڈ، لاہور پر اپنا قبضہ جما چکے تھے، وہ جالندھری تھے۔ مودودی صاحب کو بھی پھٹہ لگانے کے لیے یہ جگہ اچھی لگی مگر ''مدرسۃ البنات'' والے مولانا صاحب بہت کایاں تھے انہوں نے مولانا مودودی کو بہلا پھُسلا کر ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور بھجوا دیا۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اُسی طرح مُلّا، مُلّا کو کاٹتا ہے۔ مولانا مودودی کو ذیلدار پارک راس آ گیا۔ سڑک پار علامہ مشرقی کا ڈیرہ تھا۔ خاصی رونق لگ گئی اچھرے میں بعد ازاں جماعت اسلامی کا ہیڈکوارٹر ملتان روڈ پر شائی فلم سٹوڈیو (موجودہ منصورہ) میں منتقل ہوگیا۔ قاضی حسین احمد کے دور میں تو جماعت اسلامی پر فل بٹا فل فلمی روپ چڑھا۔ ''ظالمو! قاضی آ رہا ہے''، جیسے ڈرامائی نعرے کی تخلیق ہوئی اور پھر گانا بھی بنا: ''آ جا قاضی تینوں اکھیاں اُڈیکدیاں'' جماعت اسلامی میں میاں طفیل محمد نئے شتونگڑوں کی ان حرکات پر دل تو بہت جلاتے تھے مگر اُن کی سُنتا کوئی نہیں تھا۔ مولانا مودودی کی وفات کے بعد علامتی عدت انہوں نے بھی پوری کی اور ذیلدار پارک والے گھر کے اندر موجود مودودی صاحب کی قبر کو کھود کر اُس کے اندر چھلانگ لگانے کی حرکت بھی انہوں نے ایک سے زائد بار کی۔ انہیں حیدر فاروق مودودی نے اپنے زور بازو سے اس حرکت سے باز رکھا۔ قبر کو ٹکریں مارنا تو اُن کا اُس وقت تک معمول رہا جب تک مودودی صاحب کی اہلیہ کی قبر اُن کے پہلو میں نہیں بنی تھی۔ اس طرح قبر پکی رکھنے کی حکمت اور افادیت کا پتہ چلا۔ مولانا مودودی کی قبر پکی ہوتی تو میاں طفیل محمد جانے کیا کچھ کر بیٹھتے۔

مولانا مودودی کو لاہور یوں میں اچھرے ہی کے رہائشی میاں طفیل محمد کا تعاون میسر آ گیا۔ میاں طفیل محمد کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ پاکستان میں مذہبی کاروبار خوب چلے گا۔ مولانا مودودی کی دیکھا دیکھی دیگر مُلّا حضرات کے بھی جہاں سینگ سمائے وہاں انہوں نے اپنی مساجد اور مدرسہ نما اڈے بنا لیے۔ خود کو عوام میں مشہور کرنے کے لیے مُلّاؤں نے ابتداء ''تحریک ختم نبوت'' سے کی۔ جھوٹا نبی قادیان (ہندوستان) میں پیدا ہوا تھا اور یہ سب تحریک پاکستان میں شروع کررہے تھے۔ مولانا مودودی اسی تحریک میں اندر ہوئے، سزائے موت کے قیدی بنے مگر جیل مولانا مودودی کو بھی جواہر لال نہرو کی طرح راس آ گئی۔ نہرو کی جیل سے واپسی کتاب: ''تاریخ عالم پر ایک نظر'' کے ساتھ ہوئی تھی۔ مولانا مودودی ''تفہیم القرآن'' جیل سے لے کر آئے۔ عقیتوں کا حال اللہ جانتا ہے مگر

''تفہیم القرآن'' کے ابتدائیے میں جب مولانا مودودی نے اللہ تعالیٰ کو ''ڈپٹی کمشنر'' سے تشبیہہ دی تو بہت سے لوگ جان گئے کہ مولانا مودودی ابھی تک سرکاری دباؤ سے باہر نہیں آسکے اور ڈپٹی کمشنر کا احترام اُن کی نظروں میں کیا ہے۔ میاں طفیل محمد، مولانا مودودی کے نائب تھے۔ مولانا مودودی اُن کے بارے میں اکثر کہا کرتے تھے: ''خدا نے اس کے دماغ میں عقل کی جگہ خلوص بھر دیا ہے'' مجھے اس پُرخلوص میاں طفیل محمد کی وفات کا دن بھی یاد ہے۔ جماعت اسلامی کے ذیلی ادارے PAKISTAN BUSINESS FORUM کی ایک تقریب مزنگ چونگی کے پاس FOUR SEASONS MARRIAGE HALL میں چل رہی تھی۔ اسی دوران میاں طفیل محمد کی وفات کی خبر آئی۔ پروگرام کے کمپیئر نے معمولی سا وقفہ کر کے حاضرین کو یہ خبر بتائی اور پروگرام پہلے کی طرح بدستور جاری رکھا گیا یہ سوچے بغیر کہ میاں طفیل محمد کی جماعت اسلامی کے لیے خدمات کیا کیا تھیں۔ میاں طفیل محمد کی جماعت اسلامی کے لیے نمایاں ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے میں شامل ایک پولیس سب انسپکٹر ارشد اقبال کا بیان تبدیل کروایا تھا جو اچھرہ کے ساتھ ہی کمبوہ کالونی میں رہتا تھا اور میاں طفیل محمد کا ہمسایہ تھا۔ میاں طفیل محمد، ارشد اقبال کے گھر والوں سے ملے اور انہیں قرآن اُٹھا کر یقین دلایا کہ اگر وہ اُن کا من پسند بیان عدالت میں دلوا دیں تو وہ ارشد اقبال کو بری کروا دیں گے۔ ضیاع الحق اُن کے ہاتھ میں ہے بلکہ اُن کا ہی آدمی ہے۔ چونکہ یہ بات قرآن کو بیچ میں لا کر درجنوں افراد کی موجودگی میں ہوئی تھی اس لیے ارشد اقبال کے گھر والے میاں طفیل محمد پر یقین کامل کر بیٹھے جس نے گھر بیٹھے بیٹھے انہیں ''صراطِ مستقیم'' دکھا دی۔ علامہ مشرقی جو ایک غیر معمولی حساب دان تھے اُن کا قول ہے کہ کائنات میں خطِ مستقیم یا صراطِ مستقیم کا کوئی وجود نہیں، یہ محض تھیوری کی باتیں ہیں۔ کائنات میں تو چھوٹے بڑے دائرے ہی دائرے ہیں۔

ضیاع الحق نے ''انصاف'' کے تقاضے پورے کرتے ہوئے بھٹو کے ساتھ ساتھ باقی پولیس والوں کو بھی پھانسی دے دی۔ جان بخشی کا وعدہ کر کے مارا گیا وچولا میاں محمد طفیل جو بھٹو کی پھانسی والی رات ضیاع الحق کے ساتھ ہی ایوان صدر میں شکرانے کے نوافل ادا کرتا رہا تھا اور جب بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی تصدیق ہوئی تو وہاں سے خوش خوش اُٹھا۔

بھٹو کی زندگی اپنے ہاتھ میں سمجھنے والا ضیاع الحق اپنے گرو مولانا مودودی کی زندگی تو نہ بچا سکا نہ ہی وہ مولانا مفتی محمود کو اگلے جہان جانے سے روک سکا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ تینوں ہی 1979ء میں یکے بعد دیگرے زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔ بھٹو کا تو آخری دیدار لوگوں کو نصیب ہو گیا تھا۔ ضیاع الحق کا سوائے خونخوار جبڑے کے کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا جو کسی کو دکھایا جاتا۔ مردِ مومن کو موت کے دوران ہندو جیسی رسومات یعنی جل مرنے کے عمل سے گزرنا پڑا۔ مسلمان حکمرانوں میں اس طرح مرنے کی یہ واحد مثال ہے۔ مولانا مودودی نے اپنے سرپرست ملک امریکہ کے ہسپتال میں آخری سانسیں لیں۔ مولانا مفتی محمود نے شوگر کے مریض ہونے باوجود اس قدر حلوہ خوری کی اور میٹھے قوام والا پان کھایا کہ بھٹو کو جنت میں زیادہ دیر اکیلا نہ رہنے دیا۔

جب پولیس سب انسپکٹر ارشد اقبال کی لاش، پھانسی کے بعد کمبوہ کالونی میں پہنچی تو رشتہ دار خواتین نے میاں طفیل محمد اور پوری جماعت اسلامی کو حاضر سٹاک جو جو گالیاں دیں اگر T.V چینلز اُس دور میں ہوتے تو اُن کی ریکارڈنگز REPEAT ٹیلی کاسٹ ضرور کرتے۔ پوری جماعت اسلامی کو میاں طفیل محمد کے جھوٹا قرآن اُٹھانے والی پھٹکار پڑی۔ جماعت ضیاع الحق کے اُٹھا اُٹھا کر اقتدار

میں تو آئی مگر یہ عارضی اور وقتی خوشی تھی۔ اُس دن کے بعد جماعت اسلامی کی مقبولیت کا گراف اور ووٹ بنک کسی لا علاج مریض کی صحت کی طرح دن بدن گرتا چلا گیا۔ آج جماعت اسلامی جس طرح وہیل چیئر پر بیٹھی اپنے آخری دن گن رہی ہے وہ میں اور آپ سب دیکھ رہے ہیں۔

جماعت اسلامی کے سینئر رہنما لیاقت بلوچ کا بھائی سعادت بلوچ نامی گرامی بدمعاش اور ڈاکو تھا اور اسے ملتان جیل میں پھانسی دی گئی وہ کشمیر کے محاذ پر شہید ہونے والا مجاہد نہیں تھا۔ کوئی اور جماعت ہوتی تو لیاقت بلوچ کو فارغ کرتی کہ تمہارے بھائی کی سرگرمیاں جماعت کو بدنام کر رہی ہیں۔ مگر جماعت اسلامی وہ چھپڑ ہے جس میں نہا کر بھینسیں خوشی محسوس کرتی ہیں۔ لیاقت بلوچ، لاہور کے سب سے بڑے زمیندار بھی ہیں جن کے قبضے میں پنجاب یونیورسٹی کی سونے جیسی قیمتی زمینیں لیز (Lease) کے نام پر قبضے میں ہیں۔ جس پر ان کی فصلیں کاشت ہوتی ہیں اور دارارقم سکول چین کی کمائی الگ سے ہے۔

کراچی میں ایک مشہور مولانا قومی اسمبلی کے الیکشن کے سلسلے میں اپنے انتخابی حلقے میں جلسۂ عام سے پُرجوش خطاب کر رہے تھے۔ حاضرین جلسہ میں سے کسی نے مولانا صاحب سے سوال کے لیے چِٹ بھجوائی جو ہاتھوں ہاتھ مولانا تک پہنچی۔ چِٹ پر لکھا تھا: ''صوبائی خودمختاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' مولانا نے یہ چِٹ ایک نظر دیکھ کر اپنے نائب کو دی۔ نائب نے اُس پر کوئی ''بوٹی'' لکھ کر مولانا کو چِٹ واپس تھما دی۔ مولانا نے اتنے اہم سوال کا جواب جس انداز میں دیا وہ اَدا ہی دل موہ لینے والی ہے۔ مولانا کا جواب تھا: ''او میرے بھائیو (بھائیو کو انہوں نے خوب اُونچے سُروں میں خاصا لمبا کھینچا تھا) انہیں بتا دو (چِٹ بھجوانے والے صاحب کو) کہ میں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہا ہوں صوبائی کا نہیں'' بس مولانا کے یہ جواب سننے کی دیر تھی جلسہ گاہ ''نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر'' کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگی اور چِٹ بھجوانے والا اپنا سا مونہہ لے کر رہ گیا اور مولانا کی لاعلمی پر بھی ٹھیک ٹھاک پردہ پڑ گیا۔

کہنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اگر آپ صوبائی خودمختاری کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں تو قومی اسمبلی میں لینے کیا جا رہے ہیں؟

ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ ہمارے محلے کی مسجد میں پیش آیا۔ عید کا روز تھا، عید کی نماز ہو چکی تھی، دس ساڑھے دس بجے صبح کا وقت تھا۔ مسجد کے اسپیکر میں کوئی ہل چل ہوئی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ فوتیدگی کا کوئی اعلان ہوگا، غور سے سُننے کی غرض سے اپنے گھر کی چھت پر چلا گیا۔ غور سے سُنا تو مولانا صاحب فرما رہے تھے: ''او میرے بائیو! سیویاں کچیاں ہی بیج دو، پکی ہوئی سیویاں تو بہت آ گئی ہیں میرے بھائیو! اب جس نے بجھوانی ہیں وہ مسجد کچی سیویاں بجھوائے''

اُف توبہ! کمینگی اور لالچ کی انتہا تھی۔ پیٹ بھر گیا تھا سویاں کھا کھا کر۔ آنکھیں رَج گئی تھیں مگر نیّت نہیں بھری تھی۔ یہ کہنے کی توفیق نہ ہو سکی کہ سویاں بجھوانے کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے اُس کی بجائے یہ کہا کہ کچی سویاں بجھوائیں۔

ہم مولوی یا مُلّا کو جذبات سے عاری بے حس سا انسان تصور کرتے ہیں جس کا کام صرف اور صرف پانچ بار اذان دینا، نماز پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ ہماری سوچ غلط ہے۔ وہ انسان بھی ہے اور اُس کے جذبات بھی ہیں، وہ ڈانس کرنے اور گانے کے لیے شریعت کی آڑ میں اپنی بچت کا بندوبست پہلے کرتا ہے اور پھر مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے یہ آواز ON AIR ہوتی ہے: ''سوہنا آیا۔ سوہنا آیا۔

آیا۔آیا(ECHO) سوہنا آیا تے سج گئے نیں گلیاں بازار......سوہنا آیا'' میں شرطیہ اور حلفیہ لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ ملاؤں نے ڈانس کرنے کا جتنا شوق اس نعت کی آڑ میں پورا کیا اُس کا ریکارڈ کوئی اور نعت نہیں توڑ سکی اور اس نعت کی بدولت گجروں سے ٹھیک ٹھاک نوٹ بھی بٹورے گئے۔

نعت خواں آج کے دور میں کس قدر کمارہے ہیں اور کیا حرکتیں کر رہے ہیں اُس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں۔ برانڈرتھ روڈ لاہور جو مشینری کی مارکیٹ ہے وہاں ہمارا دوست کوئی سامان لینے گیا۔ بقایا 35 روپے کا تھا جو دکاندار کے پاس ٹوٹے ہوئے نہیں تھے۔اُس نے ہمارے دوست کو کہا: ''میٹھے میٹھے بھائی صاحب بقایا تو نہیں ہے میں آپ کو اُس کے بدلے دو، چار نعتیں سُنا دیتا ہوں'' دوست کا کہنا ہے کہ مجھے اُس دکاندار کا نعت کو کاروبار کے ساتھ ملا دینا اس قدر بُرا لگا کہ میں بقایا لیے بغیر ہی آ گیا۔

ایک باپ بیٹے میں ولیمہ کی تقریب کے حوالے سے بحث ہو رہی تھی۔ باپ ولیمہ پر محفل نعت کروانا چاہتا تھا اور بیٹا ریما کا مُجرا۔ جب باپ، بیٹے نے اپنی اپنی جگہ رابطہ کیا تو اویس رضا قادری اور ریما کا ریٹ ایک ہی نکلا۔ پھر فیصلہ TOSS پر ہوا جو بیٹا جیت گیا۔

اسی طرح میں نے شاہ عالمی سے کسی شادی کے سلسلے میں لمبی شاپنگ کرنا تھی۔ میرے ایک دوست نے مجھے جانے سے پہلے TIP دی کہ میں خاص طور پر اُس دکان سے شاپنگ نہ کروں جس کے مالک کے نام میں ''حاجی'' آتا ہو یا دکاندار نے داڑھی رکھی ہو کیونکہ وہاں سامان دیگر دکانوں سے مہنگا اس لیے ملے گا کہ شرعی دکاندار اپنے حج، عمرہ یا تبلیغ کا خرچہ اپنے گاہکوں ہی سے پورا کرتا ہے۔ وہ نوکری پیشہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو حج، عمرہ یا تبلیغ اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو تنگی دے کر کرتے ہیں اور مقروض بھی ہو جاتے ہیں۔ دکاندار یا کاروباری آدمی اپنے معیارِ زندگی کی قربانی کبھی نہیں دے گا اُسی کے گھر بہر صورت بکرے کا گوشت ہی پکے گا۔

چندہ مہم کو ماہ رمضان کے دوران سپیڈ دینے کا جو طریقہ کار میں نے مرید کے کی ایک مسجد میں دیکھا تو اُس مسجد کے منتظم کی ذہانت کا دل سے قائل ہو گیا اور اس کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہا۔

کِنے کِنے جانا اے اللہ دے گھر
کِنے کِنے جانا اے مولا دے گھر
بکرے لیاؤ
صدقے لیاؤ
اساں تے جانا اے اللہ دے گھر
اساں تے جانا اے مولا دے گھر

زیرِ تعلیم ننھے حفاظ مولوی کی نسبت کچھ زیادہ سیانے تھے۔ انہیں مرید کے جیسی جگہ پر بکرے کا ٹارگٹ سخت لگا۔ انہوں نے اپنی جان چھڑوانے کی غرض سے اس مصرعے کا اضافہ کیا:

کُجھ وی لیاؤ
کُجھ وی لیاؤ

کس قدر پروفیشنل انداز تھا بتا نہیں سکتا۔ موںہہ سے پھولوں کی بجائے نوٹ جھڑ رہے تھے۔ سُننے والوں کے موںہہ میں بھی پانی آرہا تھا اور چندہ دینے والوں کی جیب میں بھی سیلاب آرہا تھا۔ محنت، محنت ہی ہوتی ہے۔

یہ نعت خواں طبقہ جن لوگوں سے پیسے بٹور رہا ہے وہ سب کے سب حرام کی کمائی پیدا کرنے والے اور کھانے والے ہیں۔ مثال کے طور پر دودھ میں جی بھر کر ملاوٹ کرنے والے گجر اور پھر پراپرٹی ڈیلر۔

حسن نثار کے چھوٹے بھائی نوید نثار نے ایک بار جوہر ٹاؤن میں ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس کچھ عرصہ نوکری کی۔ تھا تو میرا ہمسایہ ہی مگر اس نوکری میں ایسا مصروف ہوا کہ ملاقات کرنی مشکل ہو گئی۔ ایک دن نوید نثار نے مجھے اتوار کے دن اپنے پراپرٹی آفس بلایا۔ وہاں پہنچا تو کسی شادی کے آثار دکھائی دیئے۔ میں نے نوید نثار سے پوچھا تو اُس نے کہا بس دیکھتے جاؤ۔ تفصیل کھانے پینے کے بعد بتاؤں گا۔ کچھ دیر بعد نعتیہ محفل شروع ہوئی۔ نوید نثار کے مالک نے نعت خوانوں پر جیسے نوٹ لُٹائے اور انہوں نے جس پروفیشنل انداز میں اکٹھے کیے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ محفل کے بعد بہت شاندار قسم کا لنچ تھا۔ آپ شادی کی تقریب پر وَن ڈِش کی پابندی لگا سکتے ہیں نعتیہ محفل پر قطعاً نہیں۔ شادیوں کا سیزن تو ہوتا ہے مگر نعتیہ محافل کا کوئی سیزن نہیں ہوتا، ان کی مارکیٹ کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی۔ کئی اقسام کا کھانا تھا مگر حضوؐر کی پسندیدہ ڈِش کدو شریف کہیں نظر نہ آئی۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے نوید نثار نے بتایا کہ اُس کے مالک نے کراچی کے کسی بندے سے 45 لاکھ میں ایک اچھا پلاٹ ہتھیایا تھا جو پچھلے ہفتے پونے دو کروڑ کا بک گیا۔ یہ نعتیہ محفل اور باقی رنگ بازی اسی بلیک منی کو وائٹ کرنے کے سلسلے میں تھی۔ یہی معاملہ لندن میں ہوتا تو الطاف بھائی کی طرح پکڑے جاتے۔

ہم پاکستانیوں کو تو مُلّا نے اپنے گھیرے میں بڑی کامیابی سے لے رکھا ہے مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ دیگر ہمسایہ مسلم ممالک نے مُلّا سے کیسے جان چھڑائی۔ سب سے بڑی مثال ترکی ہے وہاں کے مصطفٰی کمال پاشا نے اپنے ملک کے تمام سرکردہ مُلّاؤں کو دعوت دی۔ خوب کھلایا پلایا اور تحفے تحائف دے کر بحری جہاز میں سرکاری خرچے پر حج پر روانہ کر دیا اور بیچ سمندر میں بحری جہاز غرق کروا دیا اس طرح تُرکی کی تو مُلّا سے جان چھوٹی۔

اسلام کے ہیڈ کوارٹر سعودی عرب میں جب پہلے پہل ٹیلی ویژن کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو تمام مُلّا ٹیلی ویژن کے خلاف متحد ہو گئے اور حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی سوچنے لگے۔ بادشاہ نے تمام ملاؤں کو اپنے محل میں ملاقات کی دعوت دی۔ وہاں بھی تمام مُلّا ٹیلی ویژن کے حوالے سے اپنے موقف سے ایک سینٹی میٹر پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بادشاہ نے انہیں کھلا پلا کر رخصت کیا۔ جب محل سے باہر نکلے تو دیکھا اُن سب کی مرسڈیز گاڑیوں کے جگہ اُتنے ہی اونٹ کھڑے تھے اور گاڑیاں غائب تھیں۔ وہاں کے نگران نے مُلّاؤں کو بتایا کہ حضوؐر کے زمانے میں نہ ٹیلی ویژن ہوتا تھا نہ مرسڈیز، بس اونٹ ہی اونٹ ہوتے تھے۔

سب خاموشی سے اونٹوں پر بیٹھے اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ باقی کا کام اہلِ خانہ نے تمام کر دیا۔ بیوی بچوں نے وہ شرمندہ کیا اور لعن طعن کی کہ سب کو ٹیلی ویژن کے حق میں فتویٰ دینا ہی پڑا اور سب کے سر سے معاشی بحران ٹلا۔

کئی پاکستانی مُلّا حضرات سعودی عرب کے جدہ اور ریاض ایئرپورٹ پر لگی ہوئی اپنی تصویریں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور اس شاندار استقبال پر رشک کرتے ہیں لیکن جب علم ہوتا ہے کہ وہ یہاں اشتہاری اور BAN ہیں اور اگلی ہی فلائٹ سے واپس

جارہے ہیں تو اُن کے نمایاں بوتھاڑ ایک پوشیدہ حصے کی طرح لٹک جاتے ہیں۔

ایران میں بھی ملاؤں کو اپنا تھوکا ہوا ایک عجب انداز میں چاٹنا پڑا۔ شاہوں کے دور میں کھانڈ (پیلے رنگ کی چینی) کے یورپی کارخانے لگے جو شاہی خاندان ہی کی ملکیت تھے تو ایران کے تمام ملاؤں نے چینی کے خلاف شور مچا دیا کہ یہ حرام ہے کیونکہ اسے بنانے میں مُردوں کی ہڈیاں استعمال کی جارہی ہیں۔ ملاؤں کی بات کسی حد تک درست بھی تھی۔ چینی کے ابتدائی دور میں چینی آج جیسی سفید نہیں ہوتی تھی نہ ہی اسے سوڈے یا دوسرے کیمیکلز کی مدد سے صاف کیا جاتا تھا۔ گنے کے رس کو صرف ہڈی کے کوئلے سے گزارا جاتا تھا جس کے باعث گنے کے رس کی میل اور کالا پن خاصی حد تک ختم ہوجاتا تھا مگر سونے جیسی پیلاہٹ برقرار رہتی تھی مگر لوگ اس حالت میں بھی چینی کو شکر اور گُڑ کے مقابلے میں پسند کرتے تھے۔

ملاؤں کے ہاہا کار مچانے سے لوگوں نے کھانڈ (چینی) خریدنی بند کردی۔ کارخانے بند ہوگئے۔ شاہی خاندان کو خسارہ ہونے لگا۔ شاہی خاندان نے ملاؤں کے ہاتھوں ہونے والے نقصان سے خود کو بچانے کے لیے ایک ''رشوت فنڈ'' قائم کیا۔ تمام سرکردہ ملاؤں کی تعداد کے حساب سے خوبصورت مخملیں تھیلیاں سلوائی گئیں اور اُن سب میں برابر کی رقم ڈال کر مُلاؤں کو ایک وفد کی صورت میں مدعو کیا گیا۔ مُلاؤں کو تھیلیاں دے کر کہا گیا کہ وہ چینی کے خلاف اپنی شر انگیز مہم بند کریں اور عوام کو دوبارہ چینی خریدنے پر راغب کریں۔ سب ملاؤں نے اپنے اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر حاکمِ وقت کو یقین دلایا کہ کام ہوجائے گا۔ بادشاہ کے ایک وفادار وزیر کو شک تھا کہ مُلا پیسے لے کر بھی یہ کام نہیں کریں گے۔ اُس نے سب کے سامنے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''آپ لوگوں نے عوام کے دل میں چینی کے خلاف اتنی نفرت بھر دی ہے اب اپنا ہی پھیلایا ہوا گند کیسے صاف کریں گے؟ جس کے جواب میں مُلاؤں کے وفد نے بیک زبان یہی کہا: ''یہ اب ہمارا مسئلہ ہے ہم پر چھوڑ دیں اور بےفکر ہوجائیں'' الطاف حسین حالؔی نے کیا خوب کہا:

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر

اسلام ہے ممنون بہت مولیوو تمہارا

ملاؤں نے آنے والے جمعہ کے خطبوں میں بڑا شاندار، کلاسیک قسم کا الٹرن لیا: ''اے مسلمانو! اگر تمہاری کوئی چیز ناپاک ہوجائے تو تم اُسے پاک کیسے کرتے ہو؟'' نماز جمعہ کے مجمعے نے بیک زبان جواب دیا: ''دھوکر'' اس جواب کے بعد مُلاّ نے مجمعے کو ''شاباش'' دینے کے بعد کہا: ''مُردے کی ہڈیوں سے نکل کر چینی ناپاک ہوجاتی ہے تو اُسے بھی دھوکر پاک کرلیا کرو'' مُلاّ بادشاہ سے چینی کے سیمپل لے کر آئے تھے جو کیوبز کی شکل میں تھے۔ ہر مُلاّ نے اپنی مسجد میں مجمعے کے سامنے چینی کے ٹکڑے کو پانی میں ڈبوکر پاک کر کے دکھایا اور پورے ایران میں اگلے روز سے عوام چینی کیوبز کی صورت میں خرید کر، پاک کر کے استعمال کرنے لگے۔ ایرانی روایت پسند ہیں آج بھی چینی اس طرح قہوے کی پیالی میں ڈبوکر پاک کر کے استعمال کرتے ہیں۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ چینی تو مُلا کے کہنے سے ناپاک بھی ہوگئی تھی اور پاک بھی ہوگئی۔ پاکستان مُلاّ سے کیسے پاک ہوگا، مُلاّ کو کہاں ڈبونا پڑے گا؟

ابتدائی اسلامی تاریخ پڑھ کر دیکھ لیں۔ دین حضورؐ، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کا ذریعہ روزگار تو نہیں تھا۔ وہ بھی فاقے

سے رہا کرتے تھے۔ ذریعۂ معاش تجارت یا مالِ غنیمت تھا، جو حلال تھا اور مسجد کے لیے بھی زمین خریدی جاتی تھی یا کوئی عطیہ کر دیتا تھا مگر مسجد کی جگہ قبضے کی ہرگز نہیں ہوتی تھی جیسی پاکستان میں ہوتی ہے۔

جس علاقے میں ایک مسجد کی گنجائش تھی وہاں مُلّا کی لالچ نے مسالک کے نام پر کئی مساجد بنا دیں۔ پوری طرح ایک بھی مسجد نہ بھری مگر ہر مسجد کے مُلّا کا پیٹ بھر گیا اپنے پورے قبیلے کے ساتھ۔ چند سورتیں رٹ کر درجن بھر کچے پکے اسلامی تاریخی واقعات یاد کر کے گریڈ اٹھارہ جیسی آمدن اور مراعات کون نہیں چاہے گا؟ اسلام کے نام پر چلنے والی صنعتوں میں سے کچھ کے نام گنوا دیتا ہوں باقی آپ کو خود بخود یاد آجائیں گے۔ کئی اقسام کی مسواک، جائے نماز، تسبیح، شہد، کلونجی، عرقِ گلاب اور سب سے بڑھ کر کھجور۔ آدھا اسلام داڑھی میں ہے اور آدھا کھجور میں۔ اسلامی کتابیں، CDs اور DVDs میں بھی بہت سرمایہ کاری ہو چکی ہے۔ جب بھی ان سب اشیاء کی سیل کم ہو گی تو یہ سب ''اسلام خطرے میں ہے'' کا شور تو لازمی مچائیں گے۔ اسلام فروشی کا یہ کام خوب چل نکلا۔ ہر فرقے کی نئے رنگ کی پگڑی۔ بازار میں رنگ ختم ہو گئے مگر ملاؤں کی تقسیم در تقسیم کا عمل نہ رُکا۔ علامہ طاہر القادری کو ہم نے شریف خاندان کی سرپرستی میں خوب ترقی کرتے دیکھا۔ منہاج القرآن یونیورسٹی کے لیے زمین حکومت پنجاب نے دی باقی کام چندے سے پورا ہو گیا۔

گرمیوں میں ٹھنڈے موسم کا مزا لینے تمام بڑے مُلّا یورپی ممالک کا رُخ کرتے ہیں۔ الطاف گوہر نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ اس موسم میں مولوی مرغابیوں کی طرح یورپی ممالک میں اُترتے ہیں۔ سعودی عرب کو ہم اسلام کا ہیڈ کوارٹر مانتے ہیں۔ وہاں کس کو داخلے کی اجازت ہے اور کس کو نہیں ہے؟ پتہ کروا کر بڑی آسانی سے ''مُلّا شماری'' کروائی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں مُلّا کو ٹھیک ٹھاک کھڑکایا ہے، وارث شاہ نے بھی اور بلّھے شاہ نے بھی۔

لال قلعہ دِلّی پر جھنڈا لہرانے کی بات قاضی حسین احمد نے کی تھی، جو پوری نہ ہو سکی۔ جامعہ قادسیہ لیک روڈ، لاہور نے البتہ چو بُرجی پر اپنا جھنڈا لہرا کر یہ غم کسی حد تک غلط کر دیا۔ جامعہ قادسیہ اپنا ہفت روزہ اخبار نکالتی ہے۔ اُس کا ایک شمارہ اعزازی طور پر مجھے ڈاک میں ملا۔ گیٹ اپ اچھا تھا۔ مواد بھی اچھا اور تحقیقی تھا۔ کچھ روز بعد فون آیا۔ مجھ سے میرا نام پوچھ کر اپنے پرچے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ میں نے غیر جذباتی انداز میں ''اچھا'' کہا تو حیرت سے پوچھا گیا: ''صرف اچھا؟'' جس پر میں نے کہا: ''بہت اچھا'' اس پر دوسری طرف سُکھ کا سانس لیا گیا اور مجھ سے دریافت کیا گیا کہ میں نے پرچے میں خاص بات کیا محسوس کی؟ میں نے کہا کوئی خاص بات نہیں۔ بس معیار اور مواد معیاری ہے۔ جس پر مجھے کم فہم سمجھتے ہوئے وضاحت کے ساتھ بتایا گیا: ''جنابِ محترم اس میں کسی جاندار کی تصویر نہیں ہے۔ یہ ہے ہماری خاص بات'' دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے میں نے کہا: ''اچھا تو آپ سپرے والی تصاویر کی بات کر رہے ہیں؟'' ''جی جی'' دوسری طرف سے خوش ہو کر کہا گیا جیسے ہی میں نے یہ کہا: ''تو پھر آپ کرنسی نوٹوں اور پاسپورٹوں کا کیا کرتے ہیں؟'' تو فون اچانک بند ہو گیا۔ ''ڈینگی سے ڈرنا نہیں لڑنا ہے'' آپ پنجاب گورنمنٹ کے اس اشتہار میں صرف ''ڈینگی'' کو ''مُلّا'' سے بدل لیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاءاللہ!

شریفوں کا شریف ـــــ خالد شریف

جس طرح انسانی جسم میں بال خود بخود گھٹتے اور بڑھتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی بڑھتے رہتے ہیں اور انسان کو ان کے لیے کوئی خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی، اسی طرح سینئرز کی وفات پر جونیئر از خود سینئرز کی جگہ لے لیتے ہیں چاہے وہ اُس مقام کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ جیسے نثری ادب میں شوکت صدیقی کی جگہ انتظار حسین آ گئے جو شوکت صدیقی کی زندگی میں اُن کے ادبی ٹرالر کے پیچھے پیچھے سوزوکی کارکی طرح بڑے احترام اور سبک خرامی کے ساتھ چل رہے تھے۔ شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' سپرہٹ ہوا تو انتظار حسین مزید انتظار نہ کر سکے اور ''بستی'' لکھ مارا۔ لیکن وہ بات کہاں۔ ''خدا کی بستی'' دنیا کی تمام بڑی زبانوں سمیت روس کی 17 علاقائی زبانوں میں بھی طبع ہوا۔

شاعری میں تو اور بھی طرفہ تماشا ہوا۔ مصطفیٰ زیدی کی جگہ ناصر زیدی نے لینے کی کوشش کی۔ جوش ملیح آبادی کے مغالطے میں اے۔ جی۔ جوش داد پانے لگے۔ احمد ندیم قاسمی کا گدّا عطاء الحق قاسمی نے سنبھالا۔ منیر نیازی کی جگہ سندھوری آواز والے اجمل نیازی اپنا کام ڈالنے لگے۔ میرا جی کی جگہ بیرا جی وارد ہوئے۔ جارج برناڈ ''شاہ'' کے TEA BOY سعد اللہ شاہ نے انگریزی کی ٹانگ توڑنے کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی مونہہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا اور احمد فراز کا خلاء جس طرح عامر فراز نے پُر کیا وہ تو توبہ توبہ کروا دینے والا تھا۔

اَدبی تاریخ میں خالد شریف کا معاملہ کچھ ٹیڑھا سا ہے۔ گرونانک کی طرح کوئی انہیں دفنانا چاہتا ہے اور کوئی جلانا......مگر خالد شریف کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ یہ منجی سمیت ہی غائب ہے اور وہ منجی بھی امانتاً بابرا شریف سے لی گئی ہے کیونکہ انہوں نے زندگی بھر اپنی منجی تلے ڈانگ نہیں پھیری بلکہ ساری زندگی ٹھرک ٹھرک کے گزاری۔

''ماورا'' کی شہرت ماورائے عدالت اقدامات کے باعث بھی رہی ہوگی مگر اصل شہرت اور شان تو محسن نقویؔ کے شعری مجموعے ہیں۔ ہاں کسی زمانے میں یہاں سے شفیق الرحمن کے نثری مجموعے بھی شائع ہوئے۔ کسی شاعر کا مقام اُس کے کلام کے اوریجنل اور بے ساختہ ہونے سے بنتا ہے اور اشاعتی ادارے کی ساکھ رائٹرز کو دی جانے والی رائیلٹی سے۔ اللہ معاف کرے خالد شریف اور ''ماورا'' ان اوصاف سے تہی داماں ہونے کا خفیہ اعلان کئی بار کر چکے ہیں۔

خالد شریف کو خوش قسمت اور محسن نقوی کو بدقسمت صرف اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں میں تعلق ناشر اور شاعر والا بن گیا ورنہ یہ دونوں اپنے اپنے مدار میں گردش کرتے رہتے تو اَدبی تاریخ خاصی مختلف ہوتی۔ اوریجنل شاعری ویسے تو خود ہی الہامی سا عمل ہے اوپر سے درویشی اس سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ محسن نقوی کا شماراُن چنیدہ شعراء میں کیا جاتا ہے جو اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی مشہور تھے۔

مرزا غالبؔ نے اپنے کلام کا خود ہی انتخاب کیا اور جسے انہوں نے ہلکی شاعری سمجھا اُسے اپنے دیوان سے نکال باہر کیا۔ ذاکر

ہونے کے باعث محسن نقوی کا آنا جانا مختلف شہروں بالخصوص اپنے آبائی شہر ڈیرہ غازی خان لگا رہتا تھا۔ اپنا کوئی بھی شعری مجموعہ طبع کروانے کے لیے وہ اپنی ڈائریاں خالد شریف کو امانتاً سونپ جایا کرتے تھے۔ کمپیوٹر کمپوزنگ کا زمانہ نہیں تھا۔ حضرتِ خالد شریف، محسن نقوی کو کتابت شدہ کتاب اشاعت سے پہلے دکھاتے تو وہ مسکراتے اور چائے پان سے شغل فرماتے ہوئے عجلت میں اُسے دیکھتے جاتے۔ جو غزل یا نظم انہیں ہلکی محسوس ہوتی اُسے نکال کر کتاب سے علیحدہ ایک طرف رکھ دیتے جس کا صاف مطلب تو یہی ہوتا تھا کہ اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دو مگر وہ خالد شریف کی پبلشرانہ سوچ سے واقف نہیں تھے جو فطرتاً وہ نیاریا تھا جو سنار کی دکان کا کوڑا بھی خرید لیتا ہے کہ بوقتِ ضرورت کام آئے گا اور اس کی چھان پھٹک سے کچھ نہ کچھ تو نکلے گا۔

اُس زمانے میں کتابت مہنگی تھی اور محسن نقوی کا کلام اُس سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ خالد شریف، محسن نقوی کے سامنے مسترد شدہ مواد انکساری اور بے پروائی کا ایک نایاب و نادر مجسمہ بن کر ایک طرف تو رکھ دیتا تھا مگر اُس کے دل میں اس مالِ غنیمت پر جو لڈو پھوٹتے تھے اُن کے سامنے اولمپک گیمز کی اختتامی اور افتتاحی تقریبات میں ہونے والی آتش بازی بھی ماند پڑ جاتی تھی۔ کبھی کبھی مزید کلرنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسترد شدہ کتابت محسن نقوی کو نمایاں طریقے سے دکھاتے ہوئے DUST BIN میں بھی ڈال دیا کرتا تھا مگر اُن کے وہاں سے اُٹھتے ہی اپنے ذاتی کاغذات اور کیش والی الماری میں منتقل کرنا نہیں بھولتا تھا۔ محسن نقوی اگر سونا تھے تو خالد شریف وہ نیاریا تھا جو سنار خانے کے کوڑے سے سونا نکالنے کا ہنر جانتا تھا۔

محسن نقوی کی دو چار کتابوں کے مسترد شدہ درجنوں اوراق سے خالد شریف کی ایک کتاب یعنی عاجزانہ سی پیشکش بڑے آرام سے تیار ہو جاتی تھی بالکل ویسے، جیسے بعض ہوٹلوں کے کرپٹ بیرے سوفٹ ڈرنک کی بوتلوں میں باقی رہ جانے والے مشروب کی مدد سے ایک نئی بوتل از خود تیار کر لیتے ہیں۔ انہیں صرف ہاتھ سے دھپا مار کر نئی بوتل پر ڈھکن لگانے کی زحمت کرنے کے بعد اُسے ایک بار پھر فریزر میں رکھنا ہوتا ہے۔ یقیناً قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ محسن نقوی، خالد شریف کی اس حرکت کو کیونکر برداشت کر پاتے ہوں گے؟ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ محسن نقوی کا دریائے سخن اپنی روانی پر تھا۔ وہ بہت ہی وضع دار انسان تھے اگر اُن کے چار پانچ مجموعوں کی زکوٰۃ سے RE-MIXING کے بعد خالد شریف کی کوئی کتاب آ بھی گئی تو وہ اپنی درویشانہ اور رندانہ صفت کے باعث اسے برداشت اور درگزر کر جاتے تھے۔ شراب تو ویسے بھی سارے غم بھلانے کے لیے خاصی مشہور ہے۔

ہمارے لیے یہ گھٹیا اور کمینی حرکت ہوگی مگر محسن نقوی کی نظر میں خالد شریف کا اُن کی کتابوں کو طریقے سلیقے سے شائع کرنا ہی بہت بڑی بات تھی۔ یہ بات بھی کون سی راز ہے کہ 90 کی دہائی میں شمسہ کنول کو اوسط درجے کی گلوکارہ سے درجہ چہارم کی شاعرہ بنا دینا محسن نقوی ہی کی عطا تھی جس کے پبلشر طاہر عباس رضوی، محسن نقوی کے قریبی دوست تھے۔ کتاب کی اشاعت اور شاعرہ کی قربت سے محرومی وہ صدمہ تھا جسے وقتی طور پر خالد شریف نے بہت محسوس کیا اور کئی دن تک سر پر دوپٹہ باندھ کر بیٹھے رہے اور شوروم پر کوئی توجہ نہ دی۔

محسن نقوی کو شہرت کا ہوکا تھا ہی نہیں وہ تو مولا علیؑ کا ملنگ تھا جبکہ ناصر زیدی جیسا ضدی شاعر آج بھی زندہ ہے جیسے خود اپنے نام سے تو کوئی بڑا سول یا فوجی ایوارڈ نہ ملا مگر دو لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت لے کر لکھے گئے شعری مجموعے پر خوش قسمت شاعرہ پانچ لاکھ نقد کا

ایوارڈ لے اُڑی اور دے دلا کر بھی تین لاکھ کا خالص منافع اُس کے ہاتھ آیا۔ اور ناصر زیدی یعنی اُستادِ محترم HOLIDAY INN کی لابی میں اوپر نیچے سے سُلگ کر رہ گئے۔ شاگرد نے دوبارہ پکڑائی بھی نہ دی کیونکہ وہ چالا کو مطلوبہ نتائج اور فوائد حاصل کر چکی تھی۔ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق مانی نے بھی ناصر زیدی کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اپنی شاعری کی کتاب لکھوانے کے بعد زیدی صاحب کو نازک موڑ، مقام اور وقت پر ٹھڈا کروا دیا۔ نہر پر جناح انڈر پاس سے گزرتے ہوئے آج بھی زیدی صاحب کی آہیں اور سسکیاں سنی جا سکتی ہیں۔ ماہر عروض ہونا اور بات ہے اور نئے نوخیز، زرخیز اور رواں دواں خیالات کا مالک ہونا اور بات۔

خالد شریف ''ماورا'' شروع کرنے سے پہلے محکمہ انکم ٹیکس میں خوب مال پانی بناتے تھے۔ اس آمدنی کو WHITE کرنے کے لیے انہوں نے اشاعتی ادارہ شروع کیا۔ مشہور پنڈی وال شاعر جلیل عالی نے بتایا کہ خالد شریف نے ''ماورا'' کا آغاز گورڈن کالج، راولپنڈی کے عقب میں کیا تھا۔ وہیں سے خالد شریف پڑھے بھی تھے مگر پنڈی میں اُن کے معاملات کچھ ایسے خراب ہوئے کہ انہیں لاہور کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ اس معاملے میں خالد شریف اور ناصر زیدی کی دُکھ بھری کہانی قریب قریب ایک سی ہے۔ خالد شریف نے لاہور میں انہوں نے اپنا ڈیرہ ''بہاول پور ہاؤس'' کے سامنے، چوبرجی سے مزنگ چونگی کی طرف جانے والی سڑک پر لگایا اور وہاں سے شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) پر کتابوں کی مشہور ترین قدیمی دکان ''فیروز سنز'' کے پہلو میں ایک ٹرسٹ کی ملکیت پر واجبی سے کرائے پر قابض ہو گیا۔ پرانی بلڈنگ کے باعث اُن میں عاجزی اور خاکساری کے اوصاف پیدا ہوئے جو ہر کاروباری بندے کے لیے جھوٹے رونے کی خاطر از حد ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ ورنہ پنڈی میں انہیں رُعب دَاب کے لحاظ سے ''کھنہ'' سمجھا جاتا تھا اور G.T. ROAD پر ''کھنہ پُل'' انہی کے نام سے موسوم ہے۔ وہ دن اور آج کا دن خالد شریف نے پیچھے یعنی پنڈی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ انہیں دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ پیچھے سوائے لوٹ مار کے اور کچھ ہے بھی نہیں۔

مادہ پرستی پر اصل رنگ روپ تو آج کے زمانے میں آیا ہے اور لوگ اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں مگر خالد شریف نے تو جنم گھٹی کے طور پر دایہ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سکہ نگلا تھا، وہ اس معاملے میں ہمیشہ ہی سے آگے رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کام کرنے والے کاتب احمد صاحب (جواب سونار ہیں) بتاتے ہیں کہ مونچھوں کے زمانے میں اُس کے اندر کسی قدر انسانیت نام کی چیز ہوا کرتی تھی اور وہ اپنے زنانہ مردانہ ملاقاتیوں کو کسی تفریق کے بغیر چائے پانی حتیٰ کہ کڑوا پانی بھی پوچھ لیا کرتے تھے مگر کلین شیو ہوتے ہی تھوک سے پکوڑے تلنے لگے۔ ایک ناگہانی حادثے کے باعث مونچھوں اور بھنوؤں سے محرومی اُن کے ملاقاتیوں کے لیے خاصی تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس طرح مونچھ جیسی انسانیت کی آخری علامت اُن کے جسم وجان سے بلیڈ کھا کھا کر رخصت ہوئی۔

ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے۔ خالد شریف کو کمرشل حرکات کرنے کا بے انتہا شوق ہے۔ پہلے ''ماورا'' کے نام سے اپنا ماہنامہ شروع کیا۔ شوروم کی دھونس، نک گھسنی اور ترلے منتوں سے کچھ پبلشرز سے فور کلر اشتہار بھی قابو کیے۔ شاعروں اور ادیبوں کے نگوگوشے شائع کر کر کے اپنے ہم نام خالد احمد کی طرح ''بیاض'' کے ذریعے سینئرز کی توجہ حاصل کی اور اپنی لابی بنانے کی اپنی سی کوشش کی۔ یہ لابی بنی یا نہیں بنی؟ یہ کوشش کامیاب رہی یا ناکام؟ اس کے درست اعداد و شمار انکم ٹیکس کی طرح خالد شریف ہی بہتر جانتے ہوں گے۔

ایک شعر:

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

کے سہارے اور شہرت پر ساری زندگی گزارنا کسی بھی شاعر کے لیے مستحسن نہیں بالخصوص خالد شریف جیسے بندے کے لیے جو شاعری اور شاعرات سے کھیلتا ہو۔ یوں خالد شریف بھی مجاہدِ اول سردار عبدالقیوم خاں کی طرح صرف ایک گولی چلا کر ابھی تک کشمیر کی کمائی کھا رہے ہیں۔ اور اگر یہ اکلوتا شعر بھی تحقیقی طور پر حرام زادہ ثابت ہوگیا تو کھوتا ہی کھوہ میں پڑ جائے گا۔ میر تقی میر جیسے 72 نشتر نہ سہی دو چار شعری SIMS تو اپنے پاس رکھیں تا کہ ایک شعر پر پڑا ہوا سارا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ محسن نقوی کے سوگ میں خالد شریف نے شاعری ترک نہیں کی بلکہ انہیں شعری امداد ہی ملنی بند ہوگئی۔ محسن نقوی تو بس ایک ہی تھا اُن کے بعد ''ماورا'' سے شائع ہونے والے شعراء کا کلام خالد شریف کے کسی کام کا نہ تھا۔ اوپر سے وہ سب خالد شریف کو ''اُستاد'' بھی کہتے تھے۔ مگر اب وہ عظیم شعراء کی عظیم شعری روایات کہاں جب طرحی مشاعرے میں کسی بھی شاعر (سینئر جونیئر کا امتیاز کیے بغیر) کی اعلیٰ ترین غزل سن کر تمام شعراء اپنی اپنی غزلیں شمع دان کی نذر کردیا کرتے تھے۔ اُس شاعر کے کلام کو حرفِ آخر اور حاصل مشاعرہ سمجھتے ہوئے۔ مگر وہ زمانے گئے، اب تو مشاعروں میں سینئر کہلوانے کی نیّت سے شعراء حضرات جان بوجھ کر دیر سے آتے ہیں تا کہ انہیں مشاعرے کے آخر میں پڑھوایا جائے یا اپنا نام قریب آنے پر WASH ROOM جانے جیسا رسک بھی لے لیتے ہیں۔ اگر رسک نہیں لیتے تو وہ خالد شریف ہیں جنہوں نے اپنی کتاب: ''بچھڑا کچھ اس ادا سے'' کی تقریب رونمائی الحمرا ہال 3 میں رکھی تو سٹیج پر چیف جسٹس کے سٹائل والی صرف ایک کرسی رکھی گئی جو خود اُن کے اپنے لیے تھی۔ سٹیج پر صرف ایک کرسی رکھنا ''عاجزانہ عمل'' ہے؟ اُن کی عاجزی، مسکراہٹ اور شرافت سمیت سبھی کچھ جھوٹا ہے۔ عاجزانہ انداز تو یہ ہوتا کہ اُن پر تقریریں کرنے والوں کے لیے سٹیج پر کرسیاں رکھی جاتیں اور وہ خود سٹیج کے فرش پر بیٹھتے اور اگر حاضرین فرمائش کرتے تو ناچ بھی کر کے دکھاتے۔ آخر سرسیّد نے بھی تو چندے کی خاطر ڈانس کیا تھا ناں۔ اگر انہیں ڈانس کے باعث دو، چار کتابیں چھاپنے کو مل جاتیں تو کیا بُرا تھا۔ یہ اعزاز صرف شاہدہ منی کو ہی حاصل ہے کہ اُس نے اپنے گانے پر عبدالستار ایدھی اور گُل جی جیسے بزرگوں کو بھی ڈانس پر مجبور کر دیا تھا۔

خالد شریف کو اپنے مقام میں کسی اور کی شرکت پسند نہ آئی۔ ''ماورا'' سے چھپنے والے شاعر اور ادیب اُن کی مدح سرائی کرتے ہوئے سٹیج پر بغیر سانس لیے اس ادا سے رخصت ہوئے کہ خالد شریف جیسے ضحاک کی جگہ کوئی جلاد بھی بیٹھا ہوتا تو اُسے اُن پر ترس آجاتا۔ مگر خالد شریف ''کھنہ'' بن کر بیٹھا رہا۔ فنکشن کا اختتام اگر HI-TEA پر ہوتا تو بات بن بھی جاتی مگر یہاں تو خالد شریف کا بُوتھا شریف دکھانا ہی بہت کافی سمجھا گیا تھا، سادہ پانی یا چائے کی جھلک تک نہیں کروائی گئی تھی۔ خالد شریف نے جانے کیسے سمجھ لیا تھا کہ محض اُن کے رُخِ انور کی زیارت کو شرکائے تقریب ایک اعزاز سمجھیں گے جس کے بعد چائے بسکٹ کی چنداں ضرورت نہیں رہے گی۔ اس عملِ کمینائی کے بعد حاضرین کا احتجاج اور ''شاک انگیز'' اثرات بذریعہ SMS اور کالز خالد شریف تک پہنچتے تو رہے مگر وہ اپنی ازلی ڈھٹائی کے باعث یہ سب کچھ پی گئے۔ ہاں! یاد آیا تقریب کے آخر میں کچھ شرکاء نے GO SHAREEF GO کے

نعرے بھی لگائے تھے۔

خالد شریف میں تو ایسے شاکس برداشت کرنے کی صلاحیت ہے مگر وہ اپنے شوروم کے سٹاف میں بھی یہی خوبی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے سٹاف کی اعصابی آزمائش کے لیے انہوں نے کتابوں کے شوروم میں انڈر ہینڈ لیے گئے گارمنٹس سیل کرنے کا ایک ''دانشمندانہ'' منصوبہ بنایا اور اُسے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی طرح اپنے سٹاف سے خفیہ رکھا۔ شوروم کو آدھا آدھا کیا گیا۔ گارمنٹس کی کوئی مسترد شدہ لاٹ تقریباً مفت اُٹھائی گئی۔ شوروم سٹاف کی تنخواہوں میں اضافے کی بجائے اُن کے اوقات کار میں ''شریفانہ کم جابرانہ'' اضافہ کر دیا گیا۔ اس آدھے تیتر اور آدھے بٹیر کا نتیجہ بہت مایوس کن نکلا۔ بجائے اس کے کہ گارمنٹس کی اضافی آمدنی ہوتی، کتابوں کی سیل کا گراف بھی نیچے چلا گیا۔ چار چھ مہینے کی ذلالت کے بعد خالد شریف کو خود ہی احساس ہوا کہ ''آئے ہوئے کپڑے'' اُن کو راس نہیں۔ دل پر بھاری پتھر رکھ کر یہ بھنگ بھوسڑا اپنے شوروم سے کوڑے کی طرح اُٹھوایا اور سٹاف ایک عرصے بعد سکون کی نیند سویا ورنہ گارمنٹس کی SMELL نے اُن کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

کتابوں کی دکان میں گارمنٹس کا کام خالد شریف کی وہ حماقت تھی جس پر انہیں ذہین قرار دینے والے بھی سوچ میں پڑ گئے اور بہت سوں نے اپنی پہلی رائے بدلتے ہوئے اُن کا نام اپنے ذہن اور موبائل سے DELETE کر دیا۔ گارمنٹس جیسا پچ تلنے کا سائیڈ افیکٹ یہ ہوا کہ ''ماورا'' آنے والی شاعرات کی اکثریت تحفظات کا شکار ہوگئی۔ گارمنٹس کے نام پر ہونے والی فحاشی کی اس نمائش کو برداشت نہ کر سکی۔ نا صرف شاعرات بلکہ ڈاکٹر علی ظہیر منہاس جیسے اُن کے پرانے گنجے عاشق بھی شورُوم سے رستہ بدل کر گزرنے لگے۔

اپنا غم غلط کرنے کے لیے خالد شریف نے ٹمپل روڈ پر لاہور میرج ہال کے سامنے ماورا۔ 2 بھی بنایا مگر وہ بھی سُرعت سے فارغ ہوگیا ورنہ ریاظ آرٹسٹ نے انہیں وہاں بڑی فراخدلی سے خوش آمدید کہا تھا۔ خالد شریف کے ہاتھوں مالی اور جسمانی طور پر لُٹنے والوں میں بڑی تعداد شاعرات کی ہے، جنہیں یہ باگڑ بلا بری طرح پڑ جاتا ہے۔ مجھے SOS کالز کرنے والی کچھ شاعرات تو یہ ہیں: شمینا علی، فرح دیبا، فاطمہ سحر اور ڈاکٹر مزمل بھٹی۔ خالد شریف بھی دوہری ذہنیت کے مالک ہیں اُن مردوں کی طرح جو اپنی بیگمات پر تو TRACKER لگوا کر رکھتے ہیں مگر دوسروں کی بیویوں کو مختصر ترین لباس میں دیکھنا پسند کرتے ہیں بلکہ وہ بے لباس بھی آ جائیں تو انہیں ''جنسی پناہ'' دینے پر بخوشی تیار ہو جاتے ہیں۔

ایک مظلوم شاعرہ جس نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی مجھ سے قسم لی ہے، وہ زنجیر عدل ہلانے اور دل دہلانے عطاء الحق قاسمی کے پاس گئی۔ عطاء الحق قاسمی نے اُسے اپنی مکمل حمایت کا یقین دلانے کے بعد حسن عباسی سے رابطہ کرنے کو کہا کہ وہ اُن کی کتاب ''ماورا'' سے آدھے خرچ پر نستعلیق انداز میں طبع کر دے گا۔ شاعرہ فوری ایکشن چاہتی تھی اُس نے قاسمی صاحب کو کہا: ''الحمراء سے ماورا زیادہ دور نہیں۔ ایک بیٹی کی پکار پر عرب سے محمد بن قاسم ہندوستان بھاگم بھاگ پہنچ گیا تھا۔ آپ میرے ساتھ خالد شریف کے پاس نہیں جا سکتے۔ آپ سیدھی طرح اُٹھتے ہیں یا آپ کو فورک لفٹر سے اُٹھواؤں''؟

ان کے علاوہ بھی جانے کس کس کو خالد شریف نے اُلٹی چھری سے ذبح کیا ہوگا جس پر ہر سرمایہ دار خفیہ اور علانیہ فخر کرتا ہے شکر ہے خالد شریف حج اور عمرے کے چکر میں نہیں پڑتے ورنہ ان کا خرچہ بھی ''مرے مُکے'' شاعروں سے نکالتے۔ خالد شریف کے ہاتھوں

لٹ پٹ جانے والیوں میں ایک نمایاں مثال ڈاکٹر قمر آراء چوہدری کی ہے، جس کا شعری مجموعہ: ''خواب آنگن'' شریفے ڈاکو نے 90 کی دہائی میں، جو کہ سستا زمانہ تھا، ڈیڑھ لاکھ کی خطیر رقم ہتھیا کر شائع کیا۔

خالد شریف کا نام زندہ رکھنے کے لیے اُن کا سابقہ ملازم صفدر حسین ہی بہت کافی ہے جو اُن سے بھی بڑا اچھرا ہے اور اُن کی خصوصی تربیت کے باعث صرف شاعری ہی چھاپتا ہے۔ خالد شریف نے تو اشاعتی ادارہ چلانے کے لیے انکم ٹیکس جیسی اعلیٰ سرکاری نوکری کی قربانی دی مگر بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ کے مصداق صفدر حسین محکمہ تعمیرات میں دھڑلے سے نوکری بھی کر رہا ہے اور اپنا اشاعتی ادارہ ''الحمد پبلی کیشنز'' بھی چلا رہا ہے اور اوپر سے کلرک ایسوسی ایشن کا صدر بھی ہے۔ اُس کی کلرکانہ شان اپنے سابق باس خالد شریف سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ گردن کے نیچے گارڈر، رکھ کر سوتا ہے۔

خالد شریف نے اپنے ہونہار شاگرد عزیزم صفدر حسین کو مرغا بنا کر جو 5 سنہرے اشاعتی اصول از بر کروائے وہ یہ ہیں:

1- شاعری کی کتاب حاصل کرنے کے لیے سیاچن بھی جانا پڑے تو جاؤ۔

2- شاعری کی کتاب میں کمپوزنگ کا خرچہ خاصا کم ہوتا ہے۔ پروف ریڈنگ شاعر خود کرتا ہے اور جلدی میں ہوتا ہے اس لیے شاعری کو ہمیشہ ترجیح دینا۔

3- کسی بھی شاعر کو چائے اُس وقت تک نہ پوچھنا جب تک ڈاکٹر اُس کو نسخے میں DRIP لکھ کر نہ دے۔

4- ''جس نے رائیلٹی دی وہ ہم میں سے نہیں'' پس پُشت بڑا سا کر کے لکھوانا۔

5- کسی بھی شاعرہ کو خونی رشتہ دار سمجھنے کی بجائے خونی اور ہوس بھری نظروں سے دیکھنا تا کہ مارے خوف کے وہ شاعری سمیت اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر جائے۔

نوٹ: ہونہار شاگرد نے 5 اصولوں کو 10 تک ترقی دے دی اور یہی خالد شریف کا توشۂ آخرت ہے!

آصف علی زرداری (موقع پڑنے پر ناجے لوہار کے بڑے بھائی جان) تو صرف 10% لے کر مسٹر ٹین پرسنٹ کے نام سے پورے پاکستان میں بدنام ہے جبکہ خالد شریف کتاب پر صرف اپنے ادارے کا نام دینے کے 25% وصول کرتا ہے۔ بڑا ڈاکو کون ہوا؟ 25% وہ شرح ہے جو جاپانی HONDA کمپنی اپنے پاکستانی شراکت داروں سے محض اپنے نام کے وصول کرتی ہے۔ HONDA اور MAVRA کا آپس میں کیا موازنہ؟

پیارے دوست اقبال چیمہ، خالد شریف سے اپنی ایک ماورائی ملاقات کا احوال یوں بتاتے ہیں جو ماہ رمضان میں ہوئی۔ خالد شریف نے 42 نمبر والی ایک مشکوک سی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی جب اُس کا قریب سے معائنہ کیا گیا تو وہ کسی شاعرہ کی بھولی ہوئی عینک کا کشمیر جیسا اٹوٹ انگ نکلی۔ غالب امکان یہی ہے کہ شاعرہ خالد شریف کی روزوں والی گرمی نکلوانے آئی تھی مگر جلدی میں جاتے ہوئے اپنا بکھرا ہوا مال و اسباب سمیٹنا بھول گئی۔ بجائے یہ کہ خالد شریف شاعرہ کے پیچھے اپنا ملازم دوڑاتے جو اُس کی امانت واپس کر آتا، خالد شریف نے ٹوپیاں بنا کر اُن کا دوسرا بہترین استعمال کر ڈالا۔ اس لحاظ سے خالد شریف کا ''دوسرا'' سعید اجمل سے بھی زیادہ EFFECTIVE نکلا۔

اس خاکے کو لکھنے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی جسے میں اپنے قارئین کے ساتھ شیئر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہوا یوں کہ میں اس خاکے کو فائنل کرنے کے بعد کمپوز کروانے جا رہا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں وائس چانسلر ڈاکٹر مجاہد کامران صاحب کے آفس سے نکلتے ہوئے سیّد سجاد حیدر شاہ پر نظر پڑی، جو اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے اور واپس کراچی جا رہے تھے۔ اُن کی فلائٹ دُھند کے باعث کینسل ہوگئی تھی۔ اُن کے ہاتھ میں اُن کی کتاب ''زیرزباں'' تھی جو ''ماورا'' ہی سے شائع ہوئی تھی۔ ''ماورا'' سے شائع ہونے والی کتاب اپنے گیٹ اپ کے باعث دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ میں نے سرسری طور پر ورق گردانی شروع کی تو ایک سے بڑھ کر ایک شعر میرے سامنے کیٹ واک کرنے لگا۔ شاہ صاحب کا ایک شعر تو میرے دل پر ایمان علی کی طرح نقش ہو کر رہ گیا:

درِ اقدس پہ عجب ایک سماں دیکھا ہے

میں نے تخلیق سے پہلے کا جہاں دیکھا ہے

جسے پڑھ کر مجھے سیّد سجادہ حیدر شاہ کو فوری طور پر ''محسن نقوی ثانی'' کا خطاب دینے کو جی چاہا۔ شاہ صاحب چاہیں تو خالد شریف کی طرح اسی ایک شعر کی کمائی ''کھا پچا'' سکتے ہیں مگر وہ ایسا کریں گے نہیں۔ اُن کے تخلیقی جال میں ایسے شعروں جیسی کئی تڑپتی مچھلیاں ہیں۔ باوجود اس کے کہ شاہ صاحب وائس چانسلر کے ساتھ پُرتکلف چائے نوش فرما کر آئے تھے، مجھے لے کر پنجاب یونیورسٹی کی کینٹین پر چلے آئے۔ گپ شپ لگتی رہی جس سے میرے علم میں ایسا قابل قدر اضافہ ہوا کہ مجھے یہ خاکہ از سر نو لکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ خاکے والا یہ میچ جو بظاہر DRAW کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا اچانک میچ کے آخری اوور میں شاہ صاحب کے SIXER کے باعث ڈرامائی طور پر نتیجہ خیز بن گیا۔

میں نے شاہ صاحب کو بتایا کہ آپ کی کتاب ''زیرزباں'' کی قیمت خالد شریف نے وصولی گئی رقم، دو لاکھ تیس ہزار کو JUSTIFY کرنے کے لیے ایک ہزار روپے رکھی ہے ورنہ ایسی کتاب کی قیمت کسی بھی صورت چار، پانچ سو سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سراسر ظلم ہے شاعر پر بھی اور ریڈر پر بھی۔ شاہ صاحب کی بے نیازی کا عالم بھی اُن کے دوست محسن نقوی جیسا ہی تھا۔ انہوں نے مجھے اس معاملے پر چوہدری شجاعت حسین کی طرح ''مٹی ڈالنے'' کا مشورہ دیا مگر میں تو کمان سے نکلا ہوا تیر تھا واپس کہاں جاتا۔ کہا تو صرف اتنا کہ مال روڈ کی بڑھتی ہوئی نحوست میں خالد شریف کا بھی خاصا بڑا حصہ ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ اُن کے تعلقات کچھ اعلیٰ حکام کے ساتھ ہیں تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ شاہراہ قائداعظم ہی پر واقع وزیراعلیٰ کے دفتر جائیں اور وزیراعلیٰ سے بات کریں تاکہ ''متاثرین ماورا'' کے لیے کچھ کیا جاسکے۔ ''زیرزباں'' کی قبر کشائی اور دوبارہ پوسٹ مارٹم کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو ہوئی کیونکہ متاثرین ماورا کی تعداد تاج کمپنی کے متاثرین سے کسی بھی طرح کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوگی اور تاج کمپنی والے بھی تو ''ماورا'' کے سامنے ہی ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کی معصومیت کا مجھے ایسے اندازہ ہوا کہ جب وہ رخصت ہونے لگے تو انہوں نے بڑی سادگی سے پوچھا: ''خان صاحب! آپ کا تعلق جیو (GEO) سے ہے ناں؟'' جس پر مجھے اپنا تعارف وہاں دوبارہ بیٹھ کر کروانا پڑا۔

شاہ صاحب تو جانے کب وزیراعلیٰ سے ملاقات کریں گے مگر ابتدائی طور پر یہاں متاثرین ماورا کے لیے HELP

LINE نمبر زدیئے جارہے ہیں تا کہ شرافت کا یہ اونٹ کسی کروٹ تو بیٹھے۔

رابطہ:	04236303390 03004020955		SMS/CALL	03324822090 03004191687

نوٹ: کسی کی لٹی ہوئی عزت تو واپس نہیں لائی جاسکتی مگر لٹی ہوئی پونجی ضرور واپس دلائی جاسکتی ہے۔ کوشش اور ہمت کرنے کی دیر ہے بس!

مزید یہ کہ ''ماورا'' سے اپنے شعری مجموعے شائع کروانے والی شاعرات کو ایک خوش خبری دینا چاہتا ہوں کہ میں نے خالد شریف کی میز کے نیچے VISITORS والی سائیڈ پر ایک خفیہ الارم بٹن لگا دیا ہے۔ اب خالد شریف کسی کو جنسی طور پر ہراساں نہیں کر سکے گا۔ صرف بٹن دبانے کی دیر ہوگی 1122 کی ایک نہیں کئی گاڑیاں آ کر اس ٹھرکی بڈھے کا ٹینٹوا دبا دیں گی اور راوی چین ہی چین لکھے گا۔

خالد شریف نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر خود پر تھیسس کروانے کا سلسلہ بھی لازمی شروع کر رکھا ہوگا اور اُن کی تمام تر امیدیں خواتین مقالہ نگاروں سے وابستہ ہوں گی۔ اُن پر کام ہونا چاہیے مگر کوئی مرد مقالہ نگار بھی تو تمام تر تحقیقی سرجری آلات کے ساتھ اُن کا کام تمام کرے ناں۔ خواتین کے نازک ہاتھوں سے یہ آہنی کام کیونکر ممکن ہو سکے گا؟

سیّد سجاد حیدر شاہ صاحب کی کتاب ''زیرِ زباں'' کے فلیپ نگاروں میں ''انگارے فیم'' پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران بھی شامل ہیں، جو اشاعتی مافیا کا ایک جزو ہیں، جو نئے شاعروں کے بارے میں ہر طرح کی رائے دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر محمد کامران کا حال بتانے کے لیے یہاں میں ''ایوان اردو'' دہلی شمارہ: جون 2014 سے ڈاکٹر خالد علوی کے مضمون کا ایک اقتباس من وعن درج کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے زمانۂ طالب علمی میں ''انگارے'' مرتب کی تھی۔ آج تک اُس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ طالبعلمانہ کوشش تھی لیکن دہلی، بجنور، لکھنؤ، الہ آباد، مراد آباد کے لاتعداد اخبارات نے 1932 میں ''انگارے'' کے بارے میں جو کچھ شائع کیا تھا وہ سب جمع کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کے ایک نوجوان محمد کامران سے اس موضوع پر مقالہ ''انگارے''، ''ماورا'' لاہور سے شائع کرا دیا۔ 4 ابواب میں سے 3 ابواب کے عنوانات بھی تبدیل نہیں کیے گئے۔ اگرچہ متعدد مقامات پر راقم الحروف کا حوالہ دیا گیا لیکن بہت جگہ نظر انداز بھی کر دیا گیا ہے۔ ''سرفراز'' لکھنؤ، ''مدینہ'' بجنور، ''سچ'' لکھنؤ، ''اسٹار'' الٰہ آباد، ''ہندوستان ٹائمز'' کے حوالے اس طرح دیئے گئے گو یا وہ انہوں نے ہی کہیں سے لیے ہیں...... ''مخبر عالم'' مراد آباد اور ''مدینہ'' بجنور کے خاندانوں سے میری قربت رہی ہے۔ ظاہر ہے اُن کتب خانوں تک پاکستانی اسکالر کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بعض کاغذات کا حوالہ بھی براہِ راست دے دیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر نوجوان اسکالر احتیاط سے کام لیتے تو اس داغ سے محفوظ رہتے۔'' (صفحہ 22)

یاد رہے کہ مسز صائمہ کامران کے شعری سہولت کار بھی اتفاق سے حضرتِ خالد شریف ہی ہیں جن کے شعری مجموعے ''ماورا'' کا چولہا گرم رکھنے کے لیے از حد ضروری ہیں۔ مزید یہ دیکھنا باقی ہے کہ ڈاکٹر محمد کامران نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بہ عنوان:

''احمد علی: احوال و آثار'' میں ''انگارے'' کے ضمن میں ڈاکٹر خالد علوی کی تحقیق کو کس رنگ میں پیش کیا ہے یہ ڈاکٹر فخر الحق نوری اور ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے لیے ''لمحۂ فکریہ'' ہے۔

خالد شریف نے ''زیر زباں'' کے فلیپ پر جو الفاظ سجاد حیدر شاہ صاحب کے بارے میں کہے ہیں اگر اُن کا انطباق خود خالد شریف پر کر دیا جائے تو یہ صورت حال پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ متروکہ وقف املاک میں قائم ''ماورا'' کے باہر ماورائی انداز میں دھوتی پہنے، دھونی رمائے، ماتھے پر موقع پرستی کا تلک لگائے KFC کے بابے کی طرح صبح سے بیٹھے ہوں ''ماورا'' کے سٹاف کے آنے سے بھی کہیں پہلے بک شاپ پر تو یونہی ایک دو بجے جا کر کہیں ہوتی ہوگی، مہا تما بن کر خالد شریف بڑی جلدی اور تیزی سے راہ گیروں کی ہمدردیاں حاصل کر کے سکہ رائج الوقت حاصل کر سکیں گے۔ ''ماورا'' کو شاہراہ قائد اعظم پر دیکھ کر بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ''فیروز سنز'' کی طرح ''ماورا'' اور ''خالد شریف'' قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں اور جدی پشتی یہاں پر ہیں۔ اُن کو کیا پتہ کہ یہ بلا پنڈی سے لاہور پر نازل ہوئی۔

پاکستان میں جتنے بھی منتخب یا غیر منتخب صدور آئے اُن میں خالد شریف کی صدارت کو مشاعروں میں سب سے بڑھ کر پذیرائی نصیب ہوئی۔ سینیٹر گلزار کے گھر (گلبرگ) میں ہونے والے ایک مشاعرے میں خالد شریف صدارت کر رہے تھے اور حاضرین کے اچانک مسلسل مسکرانے اور دل کھول کر داد دینے پر حیرت اور خوشی کا شکار تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ اس غیر معمولی پذیرائی کا سبب اُن کی پینٹ کی کھلی ہوئی زِپ ہے تو مشاعرہ چھوڑ کر بھاگ گئے کیونکہ مشاعرے میں نامعقول خواتین کی ایک معقول تعداد موجود تھی جن کے مستقبل قریب میں ''ماورا'' پر آنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ خالد شریف نے ''ماورا'' جیسی ''کُڑکی'' ایسی ہی خواتین کے لیے لگا رکھی ہے۔

مشاعرے میں خالد شریف کی شرمندگی والا معاملہ ویسا ہی تھا جیسا ناصر زیدی کے ساتھ راولپنڈی میں رُخسانہ نازی کی کتاب: ''کنوارا نہیں ملا'' کی تقریب رونمائی کے دوران ہوا تھا۔ رُخسانہ نازی جو ناصر زیدی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اچانک اُٹھ کر ڈائس پر آئی اور ناصر زیدی کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''زیدی صاحب! آپ کیا اتنی دیر سے میرے پٹوں پر ہاتھ پھیرتے چلے جا رہے ہیں؟ آپ یہاں اسی کام سے آئے ہیں؟'' رُخسانہ نازی کے قوم سے اس خطاب کی دیر تھی، ناصر زیدی نے اپنے لمبے بالوں والا سفید سر میز پر جھکا دیا اور بہت دیر سکتے کے عالم میں رہے۔ حاضرین یہی سمجھے کہ مارے غیرت کے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اُس کے بعد ناصر زیدی وہاں سے اُٹھے اور لاہور بھاگ آئے اور اب پنڈی اس بات کی تسلی کر لینے کے بعد ہی جاتے ہیں کہ رُخسانہ نازی پنڈی سے باہر ہے۔

سیّد نور نے خالد شریف پر لکھے گئے خاکے کا مسودہ دیکھا تو بے ساختہ کہا: ''خان صاحب! یہ تو سیدھا سادا ٹیلی فلم کا سکرپٹ ہے مگر مجھے ذرا سوچنے تو دیں کہ خالد شریف کا مرکزی کردار کرے گا کون؟ خاصی دیر سوچنے کے بعد بولے: ''امریش پوری وفات پا چکے ہیں، مصطفی قریشی یہ رول کریں گے نہیں، شفقت چیمہ جچے گا نہیں، کیوں نہ یہ رول خود خالد شریف ہی سے کروا لیا جائے؟ شہرت اور پیسے کا تو بھوکا ہے ہی پانچ لاکھ میں بھی مان جائے گا۔ ورنہ کوئی بھی انڈین ولن پانچ کروڑ سے کم نہیں لے گا اور اگر خالد شریف کے

ساتھ اداکارہ میرا کام کرنے پر مان جائے تو خالد شریف پلّے سے بھی پیسہ لگانے کو تیار ہو جائے گا۔

عطاء الحق قاسمی سے خالد شریف اداکارہ میرا کا کئی بار ریٹ پوچھ چکا ہے مگر صرف ریٹ ہی پوچھتا ہے، کرتا کراتا کچھ بھی نہیں اپنی فرنٹ پاکٹ سے کچھ نکالنا تو حرام سمجھتا ہے مگر اپنا نام اور مقام بنانے والی اس ٹیلی فلم پر'' ماورا'' بیچ کر بھی پیسہ لگا دے گا۔ اتنا میں بھی جانتا ہوں۔'' خالد شریف پر ٹیلی فلم بنے یا دستاویزی فلم یہ میرا دردِ سر نہیں۔ خاکہ لکھنا تھا سو لکھ دیا۔

اشرف سلیم جب میرا لکھا ہوا خاکہ: ''عطاء الحق قاسمی...... میری پسندیدہ خوشبو POISON لے کر خالد شریف کے پاس گئے تو انہوں نے وہ خاکہ از حد محویت، احترام اور عقیدت کے ساتھ پڑھا۔ یہ ایک پنڈی وال کا دوسرے پنڈی وال کے لیے تحفہ تھا۔ اشرف سلیم کا کہنا ہے کہ خالد شریف کے چہرے پر بکھری روشنی دیدنی تھی۔ انہوں نے خاکے کے حوالے سے اپنے تاثرات دیتے ہوئے کہا: ''اشرف سلیم! اگر تم عرفان احمد خان سے قاسمی جیسا خاکہ میرا بھی لکھوا دو تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں''

خالد شریف کو فوری طور پر مارنا میرا مقصد نہیں تھا۔ ویسے بھی میں نے نازی دور کے جرمنوں کی طرح خالد شریف کی چربی سے کون سا ''یہودی واشنگ سوپ'' بنانا تھا اس لیے خاکہ لکھنے والا معاملہ 2014 سے 2015 تک ٹل گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خالد شریف، اشرف سلیم کو کہی ہوئی اپنی بات پر کس حد تک قائم رہتے ہیں۔

لاہور ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

لاہور پر کچھ لکھنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری پیدائش لاہور، مزنگ کی ہے۔ شک کا اظہار کرنے والے خواتین و حضرات کو مطالبے پر اور یجنل جنم پرچی بھی دکھائی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے اس شہر کے بارے کچھ کہنا یا لکھنا میرا پیدائشی حق ہے۔

لاہور میں پیدا ہونا اور بات اور اس کی ثقافتی، علمی حیثیت سے متاثر ہونا اک الگ داستان ہے۔ لاہور شہر کی معلوم تاریخ 11 صدیوں پر محیط ہے اور اس شہر کی آبادی کے قدیم ترین آثار اندرون لوہاری دروازے اور ٹبی محلہ (پانی والا تالاب) قرار دیئے جاتے ہیں۔ اک مدت تک لاہور کے باہر واحد مضافاتی آبادی اچھرہ تھا۔ ابتداء میں لاہور 12 دروازوں اور تیرھویں موری (ہنگامی رستہ یا پھر چور دروازہ) پر مشتمل اک تہذیبی شہر تھا۔ دروازوں کے نام بھی کسی نہ کسی حوالے سے رکھے گئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ لوہاری دروازہ اصل میں ''لاہوری دروازہ'' یعنی لاہور کا مین گیٹ۔ کشمیری دروازہ کا رُخ کشمیر کی جانب تھا اور دِلّی دروازے کا رُخ دِلّی کی طرف۔ بھاٹی دروازہ اصل میں ''بھٹی دروازہ'' تھا جو لاہور کی قدیم ترین قوم ''بھٹی'' سے منسوب تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پیر ذکی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی نسبت سے ''ذکی دروازہ'' نام بدل کر ''یکی دروازہ'' کہلایا۔ شاہی مسجد کے حوالے سے دروازہ پہلے ''مسیتی دروازہ'' کہلایا پھر بگڑتے بگڑتے ''مستی دروازہ'' بن گیا۔

امیر خسرو نے 13 ویں صدی میں لاہور اور قصور کو جڑواں شہر قرار دیا زیادہ دور کی بات نہیں، تقسیم سے پہلے لاہور اور امرتسر میں بھی کون سا فرق تھا؟ لاہور سے قصور، شیخوپورہ اور امرتسر ایک ہی فاصلے پر ہیں۔

لاہور کو مغل شہنشاہ اکبر نے 1584ء میں اپنا صدر مقام قرار دیا۔ اس دور میں لاہور کے شاہی قلعہ کو دوبارہ بنایا گیا اور اس کے علاوہ بہت سی تعمیرات کی گئیں۔ پورے لاہور کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ 46 فٹ گہری خندق کھود کر اس میں دریائے راوی کا پانی چھوڑ دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیب سنگھ کے دور میں لاہور شہر کو فوجی حیثیت بھی مل گئی۔ یوں یہ شہر لداخ، تبت سے لے کر جلال آباد تک کے علاقے کا صدر مقام بن گیا۔ 1849ء تک لاہور کی یہ حیثیت قائم رہی۔ 1849ء کے بعد لاہور کی عملداری میں دِلّی بھی آ گیا کہ اب وہ پنجاب کا حصہ تھا اور 1911ء تک یعنی پورے 62 سال یہ پنجاب ہی کا حصہ رہا کہ جب تک انگریزوں نے صدر مقام کلکتہ سے بدل کر دلّی نہ رکھا۔ بعدازاں انگریزی دور میں اس خندق کی بھرائی کر کے شہر کی فصیل کے گرداگرد باغ بنا دیا گیا۔ اس کے مختلف حصے حفاظت اور دیکھ بھال کی غرض سے رؤسائے لاہور کے ذمے لگائے گئے۔ اسے ''پردہ باغ'' بھی کہا جاتا تھا۔

1891ء میں میاں میر چھاؤنی بن چکی تھی جسے شامل کر کے لاہور کی کل آبادی 1,76,854 تھی۔ اس میں مسلمان 1,02,280 اور دیگر مذاہب کے لوگ 62,077 تھے۔ اِک مدت تک شہر کے دروازوں کی کیفیت یہ تھی کہ بیرونی حملے کی صورت میں یہ مقفل کر دیئے جاتے تھے اور انہی دروازوں کے اوپر سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ زمانہ امن میں بھی ان دروازوں کے

کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر تھے۔ انگریزی دَور میں دروازوں کے کھولنے اور بند کرنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

لاہور شہر کے مشہور و معروف 12 دروازوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

مشرقی سمت: 1- اکبری دروازہ، 2- دِلّی دروازہ، 3- یکی دروازہ۔

مغربی سمت: 4- ٹکسالی دروازہ۔

شمالی سمت: 5- شیرانوالہ دروازہ، 6- کشمیری گیٹ، 7- مستی گیٹ، 8- روشنائی گیٹ۔

جنوبی سمت: 9- بھاٹی دروازہ، 10- لوہاری دروازہ، 11- شاہ عالمی دروازہ، 12- موچی دروازہ (اسی سمت میں بھاٹی اور لوہاری کے درمیان تیرھویں موری ہے۔ کچھ لوگ اسے بھی دروازہ شمار کرتے ہیں)

1850ء میں انگریز اسسٹنٹ کمشنر تھارن ہل کے دَور میں لاہور شہر کی صبح شام دو وقت صفائی باقاعدگی سے ہونے لگی۔ یہ صفائی صبح نمازِ فجر سے پہلے اور شام عصر کے بعد ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور کو پانی کی سپلائی کا سرکاری نظام قائم ہوا۔ ہر اہم محلے اور چوک میں نلکے لگائے گئے جہاں سے کوئی بھی پانی بھر سکتا تھا۔ اس زمانے میں مفت پانی کی فراہمی لاہور شہر کی مقامی انتظامیہ کی ذمہ داری تھی جو اَب میٹر والے پانی کی صورت میں WASA اور بوتل والے پانی کی صورت میں نجی، دیسی و بدیسی کمپنیوں نے سنبھال لی ہے۔

کیا ہم اسے ترقی کہہ سکتے ہیں؟

انگریزی عہد ہی میں لاہور شہر کے اہم مقامات پر ''رُوڑی خانے'' بنے ہوئے تھے جنہیں پنجابی میں ''گونہہ گڈا'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں شہر کے گھروں سے اُٹھائی ہوئی غلاظت اکٹھی کی جاتی تھی۔ شہر بھر سے بھنگنیں اور بھنگی تسلے بھر بھر کر غلاظت روڑی خانے میں پھینکا کرتے تھے۔ فلش سسٹم کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اِک زمانہ تھا جب سقّوں یعنی ماشکیوں کے بغیر شہر کا بیان مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ ماشکی چمڑے کی مشک میں سرکاری نلکے یا کسی کنویں سے پانی بھر کر گھروں تک پہنچاتے تھے۔ زندگی بھر مشک اُٹھانے کے باعث وہ مستقل کبڑے ہو جاتے تھے۔

اندرون شہر کے باسی تنگ گلیوں اور گھروں میں بیٹھ کر گھریلو کام سرانجام دیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ گلی میں ہی چارپائی بچھا کر سویا کرتے تھے جبکہ گھریلو خواتین آمنے سامنے گھر کے تھڑے پر بیٹھ کر سبزی کاٹنے چھیلنے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی لگایا کرتی تھیں۔ بچے، بڑے اور بوڑھے فارغ اوقات میں انہی تھڑوں کو کام میں لاتے تھے۔ گلیوں کو روشن رکھنے کے لیے لوہے کے بڑے بڑے کھمبے نصب تھے، جن کے اوپر جالی لگی ہوتی تھی، جسے میونسپلٹی والے شام کو مٹی کے تیل کی مدد سے روشن کر دیتے تھے۔

کہنے والے تو لاہور کے تھڑوں کی مشہوری کے بارے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں کی ایک برادری ''ککے زئی'' لڑنے جھگڑنے کے حوالے سے بہت مشہور تھی۔ اسی برادری کی خواتین یعنی ککے زئینیں کسی زمانے میں اپنے اپنے گھر کے تھڑے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے کہتی تھیں:

''آنی بھیناں لڑیئے'' جواباً دوسری کہتی تھی: ''لڑدی اے میری جُتی'' بس اس منی (mini) مکالمے کی دیر ہوتی اور لڑائی

شروع ہوجاتی تھی۔ کھانا دانا بنانے کے بعد شروع کیا گیا یہ ''یدھ'' مردوں کی گھر واپسی تک جاری رہتا اور پھر اگلے روز تک لفظی جنگ بندی کر لی جاتی۔ پرانے لاہوریئے بتاتے ہیں کہ ککے زئینیں نشانی کے لیے چھابا توا یا موڑھا اُلٹا کر کے رکھ دیتیں تھیں کہ اگلے روز وہیں سے جنگ کا دوبارہ آغاز ہوگا۔ یوں اگلے روز سلسلہ وہیں سے شروع کیا جاتا تھا جہاں سے ٹوٹتا تھا۔ اسی طرح ککے زئی خواتین لڑائی کی نیٹ پریکٹس کیا کرتی تھیں۔

اس زمانے میں اگر کوئی کرایہ دار مکان خالی کرنے سے انکاری ہوتا تھا تو تھانے کچہری کے چکر میں پڑنے کے بجائے انہی ککے زئی خواتین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ وہ آ کر کرایہ دار کو ایسی ایسی خاندانی سُوا پھیر قسم کی گالیوں سے نوازتی تھیں کہ اگر وہ واقعی خاندانی ہوتا تو ''توبہ توبہ'' کرتا ہوا ایک آدھ دن میں مکان خالی کر جاتا تھا۔ شومئی قسمت پھر انگریز نے تھانے، کچہری کا بندوبست متعارف کروا دیا اور یوں محلہ کی سطح پر قائم اس طریقہ کار سے استفادہ کرنے کا کام ''ماند'' پڑ گیا۔ بات تھانے، کچہری پر رُکی نہیں کہ پھر ہوائی فائرنگ اور بدمعاشی نے بھی اس شہر کو گھیر لیا۔ شہری بندوبست میں ککے زینوں کی مدد لی جاتی رہتی اور اس میں بدلتے وقت کے ساتھ جدت پیدا کر لی جاتی تو آج شہر بربادی سے بچ سکتا تھا۔ البتہ عدالتی بندوبست میں ککے زئی مردوں کو تادم تحریر جو مقام حاصل ہے اس کا پس منظر بھی یہی ہوگا۔ اندرونِ لاہور کی کئی گلیاں اس قدر تنگ ہیں کہ بعض مکانات کے اوپری منزلوں میں رہنے والے ایک دوسرے سے اپنے گھر میں کھڑے ہو کر بغلگیر ہو سکتے ہیں۔ گلیوں اور گھروں کی تنگی ان کے مکینوں کو چھتوں پر سونے، دھوپ سینکنے، پتنگیں اُڑانے اور کبوتر پالنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان تنگ گلیوں میں پہلی بار سوئی گیس پہنچانے کا کریڈٹ لاہور کے سپوت جہانگیر بدر کو جاتا ہے۔ (بے نظیر بھٹو کے پہلے دَور میں)۔ ورنہ اس سے پہلے مٹی کے تیل کے چولہے، کوئلے یا بورے کی انگیٹھی کا رواج تھا۔

1935ء میں لاہور امپرووومنٹ ٹرسٹ بنایا گیا۔ مقصد شہری بندوبست کو بہتر بنانا اور شہر کے پھیلاؤ پر نظر رکھنا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور امپرووومنٹ ٹرسٹ (LIT) نے متوسط طبقے کے لیے 1956ء میں نئی آبادی ''سمن آباد'' متعارف کروائی جبکہ اشرافیہ کے واسطے بنایا گیا ''گلبرگ'' اس زمانے میں ''رشوت پورہ'' کے عوامی نام سے جانا جاتا تھا۔

ماڈل ٹاؤن قیام پاکستان سے پہلے ((1924 کی واحد ہاؤسنگ سوسائٹی تھی۔ اس جگہ کا پرانا نام ''ڈھپ سڑی'' تھا جسے ولائیت پلٹ انجینئر کھیم چند نے ماڈل ٹاؤن میں بدل دیا۔ 1975ء میں LIT نے LDA کا نیا نام اختیار کر لیا اور ''ٹرسٹ'' سے ''اتھارٹی'' بن گئی۔ نئے طرز رہائش نے لاہور کا کلچر بدل کر رکھ دیا۔ اندرون شہر کے باسیوں نے دو چار عشرے تک تو اس نئے کلچر کے خلاف مزاحمت کی لیکن نئی نسل کے جوان ہونے پر مزاحمت یوں دم توڑ گئی کہ نئی نسل کو موٹر سائیکل اور کار پارکنگ کے سلسلے میں اندرون شہر سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ وہ پرانی نسل کو جلتا کڑھتا، روتا دھوتا چھوڑ کر نئے علاقوں میں جا بسے۔ ان بدلتی اقدار کو کچھ شاعروں نے بھی محسوس کیا اور ان شعروں کی تخلیق ہوئی:

باپ سے ہوکر الگ جب اپنا اپنا گھر لیا
درمیاں میں فاصلوں کا ایک دریا بھر لیا

غافر شہزاد

لوگ بنواتے رہے نیچے دکاں اوپر مکاں
گھر محلے اس طرح بازار بن جاتے رہے
انجم خیالی

کوئی دریچہ ہوا کے رُخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کے گھر نہیں بنایا
اعجاز کنور راجہ

کچھ مصرف دریچہ و در سوچنا تو ہے
کس کام کا ہے اب یہ کھنڈر سوچنا تو ہے
شہزاد قمر

ہمارا گھر بھی گیا اور بھی گھرانے گئے
چھتوں کے ساتھ ہی چڑیوں کے آشیانے گئے
محسن شیخ

اندرون شہر حویلی اور احاطہ کلچر موجود تھا جو نئے زمانے کے لوگوں کو پسند نہ آیا اور وہ شہر سے نکل گئے لیکن ''لاہوری'' کہلوانا پھر بھی نہ چھوڑا۔ میں نے مزنگ سے سمن آباد 1969ء میں قدم رکھا، یہی وہ سال ہے جب انسان نے چاند پر قدم رکھا تھا اور مشہور پنجابی فلم: ہیر رانجھا ریلیز ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہاں کھیت ہی کھیت تھے۔ سمن آباد کا علاقہ کنوؤں کا علاقہ بھی تھا جن کی مدد سے کھیتوں کی سیرابی کی جاتی تھی۔ ہمارا گھر ملتان روڈ سے 10 منٹ کی پیدل مسافت پر تھا لیکن ہمارے گھر سے ملتان روڈ صاف دکھائی دیتی تھی۔ ملتان روڈ پر رات کو اونٹ گاڑیاں اور بیل گاڑیاں، سبزی سے لدی ہوئی سبزی منڈی کو جاتی تھیں۔ گاڑی بان سبزیوں کے ڈھیر پر مزے کی نیند سوتے جبکہ اونٹ اور بیل بغیر کسی اشارے رکاوٹ اور ڈرائیور کے مزے مزے سے اپنا سفر طے کرتے کرتے سبزی منڈی پہنچ جاتے تھے۔ اگر رستے میں اونٹ یا بیل سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کی درستگی اس کے عین نیچے ساتھ ساتھ چلنے والا کتا کرتا تھا۔ اِن اونٹ اور بیل گاڑیوں کے پیچھے تیل سے روشن ایک لالٹین بھی لٹکی ہوتی تھی۔ کیا سکون کے دن تھے نہ کوئی بم دھماکہ نہ ہی کوئی اور بک بک۔

ہمارے گھر (سمن آباد) کے آس پاس بہت سے گجر رہتے تھے۔ اپنی بھینسوں اور گائیوں سمیت (ابھی گجروں کو شہر بدر نہیں کیا گیا تھا اور انہوں نے فلمیں بنانی نہیں شروع کی تھیں) خالص دودھ اَرزاں ترین نرخوں پر من چاہی مقدار میں ملتا تھا۔ شیر خوار بچوں کے لیے گائے کا دودھ بطورِ خاص لیا جاتا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی بھینسوں کا بڑا اڈا تھا۔ جہاں ہر ہفتے ساہیوال سے بھینسیں لاہور بکنے یا ''نویں'' ہونے کے لیے آتی تھیں۔ یہ اڈا ایک طرح سے بھینسوں کا حاجی کیمپ بھی تھا جہاں ان کا قیام ایک دو روز کے لیے فروختگی سے پہلے پہلے ہوتا تھا۔ ان بھینسوں کی آمد پر دودھ کا نرخ ایک روپے سے گر کر 12 آنے سیر تک آ جاتا تھا۔

ہمارے گھر کے پاس بھینسوں کے اڈے کا مالک گھر گھر دستک دے کر گھر والوں کو زیادہ سے زیادہ دودھ خریدنے پر قائل کرتا تھا۔ ایسے میں خواتین موسم کے حساب سے فیصلہ کرتی تھیں کہ زائد دودھ کو کس استعمال میں لایا جائے؟ اس کی کھیر بنائی جائے، کھویا، گجریلہ یا پھر مکھن نکال کر دیسی گھی بنا لیا جائے۔ چونکہ علاقہ نیا تھا اور گھر بھی تھوڑے سے تھے اس لیے چوریاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن پتہ یہی چلتا تھا کہ چور کسی کے گھر سے چینی یا دوسری اشیائے ضرورت کے ساتھ ساتھ کھیر کا بھرا پتیلا بھی اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ ہمارے گھر سے جب فلپس کا ریڈیو چوری ہوا تو پورا محلہ افسوس کرنے آیا تھا کہ اس وقت گھر کی قیمتی ترین شے سوائے زیور اور نقدی کے ریڈیو ہی ہوا کرتی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کسی کسی خوشحال گھر میں ہوتا تھا۔ اسلحے کے زور پر پڑنے والے مثالی ڈاکے ضیاع الحق کے ''اسلامی'' دور کی دین ہیں جب ڈاکو ڈاکے کے بجائے لوگوں کے گھروں میں پکنک منانے لگے۔ نہ صرف گھر والوں کو مالی طور پر کنگال کیا بلکہ اہل خانہ کی عزت نفس بھی شدید مجروح کی۔

یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ جب ریس پر پابندی لگ جانے پر ریس کورس کو جیلانی پارک میں بدل دیا گیا۔ اسی طرح شہر لاہور میں ایک خوبصورت پارک کا اضافہ ہوا جسے گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی کی چین سموکنگ (Chain Smoking) کا ازالہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

فیروز پور روڈ پر ماڈل ٹاؤن کے ساتھ ساتھ ''غازہ پٹی'' جیسی مسیحی بھائیوں کی ایک کچی بستی (چائنہ بستی) تھی۔ نواز شریف نے انہیں وہاں سے اُٹھا کر ریلوے لائن کے پاس متبادل جگہ دے کر وہاں ''نواز شریف پارک'' بنا کر لاہور کے حسن میں مزید ''اضافہ'' فرمایا۔ وہاں چلنے والا فوارہ پانی کی اونچائی کے حساب سے پاکستان کا سب سے بڑا فوارہ ہے اور شدید گرمی کے موسم میں بھی اُس کی پھوار ٹھنڈک پیدا کر دیتی ہے۔

علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع ''گلشن اقبال'' کا افتتاح جنرل ضیاع نے کیا تھا۔ اس جگہ پر اینٹوں کا ایک متروک بھٹہ ہوا کرتا تھا جو ''پاپی بھٹہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس بھٹے کو موجودہ آبشار کی شکل دے کر پاپ دھونے کی اپنی سی کوشش کی گئی۔ یوں تو اینٹوں کے ہر بھٹے پر پاپ لازمی ہوتے ہیں لیکن ''پاپی بھٹہ'' اس نام سے معروف کیوں ہوا؟ یہاں سکول سے بھاگے ہوئے لڑکے آتے تھے اور اپنی عزت لُٹا بیٹھتے تھے۔

لاہور کی سڑکیں اب پیدل چلنے والوں کے لیے ویسی رواں نہیں رہیں جیسی ماضی میں ہوا کرتی تھیں پھر بھی بقول عظیم کرکٹر عمران خان: ''دنیا کا بہترین کھانا لاہور کی سڑکوں پر ملتا ہے''

آخر میں میری تمام مضافاتیوں سے درخواست ہے کہ لاہور کو فتح کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ یہ شہر اور اس کے باسی کسی کے قابو میں آنے والے نہیں۔ مضافاتی حضرات شہر لاہور میں اسی طرح رہیں جس طرح کھجوریں 30ویں روزے کے بعد رہتی ہیں۔ METRO بس اور آزادی چوک والے فلائی اوور نے لاہور کی خوبصورتی بڑھائی ہے۔ اب تو کراچی والے بھی لاہور کو ترجیح دینے لگے ہیں اور لاہور میں خوب جائیداد خرید رہے ہیں۔

شہر کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ نے تانگے، رہڑے، بیل گاڑی اور سائیکل کو لاہور کے منظر نامے پر خاصا محدود کر دیا ہے۔

جبکہ گدھا گاڑیوں، موٹرسائیکلوں، طرح طرح کے رکشوں اور کاروں نے آلودگی اس قدر بڑھادی ہے کہ لاہوریوں کے لیے دوربین کے بغیر تاروں بھرا آسمان دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ میں کبھی کبھار آسمان کا اصل نظارہ بارش کے بعد رات کو FORT VIEW HOTEL کی ساتویں منزل سے کافی یا چائے پیتے ہوئے کرتا ہوں۔ ان سب باتوں کے باوجود اس شہر میں کوئی ایسا سحر ضرور ہے کہ جو یہاں آ کر رہتا ہے اسی کا ہوجاتا ہے۔ شہرلاہور کے بارے برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے کہا تھا:

"Lahore is a city with a soul that has a mind of its own, its beauty is there to be seen for it draws you to it".

''لاہور ایک ایسا شہر ہے جس کی اپنی نرالی روح وتہذیب ہے۔ اس کی خوبصورتی اور رنگارنگی خاصے کی چیز ہے جو ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔''

میں ہوں پاکستان

ریاظ احمد (آرٹسٹ) کا قول ہے: ''جس کی ملکیت میں پاکستان کی جتنی زمین ہے اُسی قدر پاکستان اُس کا ہے'' میں ریاظ کے اس قول سے صد فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ پوری دنیا میں اس وقت ملکیت ہی کی تو جنگ چل رہی ہے، وسائل پر قبضے کی چاہے وہ پانی ہو یا تیل، گیس۔ جنرل مشرف سے کسی اخبار نویس نے کہا کہ جنرل پراپرٹی ڈیلری میں ملوث ہیں تو جنرل مشرف کا مونہہ جلنے والے کے مونہہ کی طرح کالا پڑ گیا اور انہوں نے سخت جواب دیتے ہوئے اپنی دُم کھڑی کر لی۔ آگ تو سچ سُن کر ہی لگتی ہے۔

پاکستان ناگزیر تھا۔ نہرو نے ایڈونیا کو اپنے دام میں پھنسا کر اور اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی گود میں ڈال کر، اپنا وزیر اعظم ہونا تقسیم سے ڈیڑھ سال قبل ہی برما میں وائسرائے کی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارتے ہوئے پکا کر لیا تھا۔ نہرو نے جاگیریں ختم کرنے کا اعلان بھی کر رکھا تھا اس لیے مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں کے لیے ہندوستان میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔ مُلّا تو انگریز دور میں کسی کھاتے میں ہی نہیں تھا۔ مدرسے کے طالب علم گھر گھر جا کر روٹیاں، سالن اکٹھا کرتے تھے اور مُلّا بذاتِ خود چندہ اکٹھا کرتا تھا۔ دور کیوں جائیں اپنے عطاء الحق قاسمی یا علامہ طاہر القادری سے پوچھ لیں۔ مُلاؤں کی ذاتی جائیداد اور نا قابل بیان ذرائع سے آمدن کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ ذاتوں کی درجہ بندی میں بھی یہ بہت نیچے لگے ہوئے تھے۔ کوئی ذاتی سواری رکھنے کا حق ان کو حاصل نہیں تھا۔ تقسیم کے وقت لاکھوں مرد و زن کی قربانی دینے کے لیے ہم ذہنی اور جسمانی طور پر تیار نہیں تھے۔ یہ حادثاتی تھی۔ انسانیت کے جنازے تو ہر طرف سے اُٹھے اور اس کے ذمہ دار تینوں مذاہب کے مذہبی علم بردار تھے۔ اگر قائداعظم، نہرو کی طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انڈو پاک کا مشترکہ گورنر جنرل تسلیم کر لیتے تو ممکن تھا کہ اس بڑے پیانے پر قتل و غارت اور املاک کا نقصان نہ ہوتا۔ تقسیم میں مسلمان، ہندو اور سکھ ہی مرے تھے، انگریز تو ایک بھی نہیں مرا۔

قائداعظم کے پاکستان میں خزانہ خالی تھا یا لیاقت علی خان جیسے کھوٹے سکے تھے۔ تحریک پاکستان کی پرانی تصاویر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ لیاقت علی خان کو تصویریں اُتراونے کا بہت شوق تھا۔ ہر تصویر میں اپنا مونہہ ڈال دیتے تھے۔ پاکستان کو پہلا قرضہ حبیب بنک نے دیا اور پہلا صنعتی یونٹ ڈنٹونک ٹوتھ پاؤڈر کا لگا۔ آغا خان سوئم نے بھی پاکستان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں قابل قدر امداد کی۔

قائداعظم کیسا پاکستان بنانا چاہتے تھے؟ اور کیسا پاکستان بن گیا۔ اس کی وجہ ابتداء ہی سے اقتدار کی رسہ کشی، سیاسی عدم بصیرت اور قبضہ گروپ کی من مانی تھی۔ نہرو نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ ہندوستان میں تمام ریاستیں اور جاگیریں ختم کر دی گئیں۔ تمام بچے کھچے مسلمان نواب، نام کے نواب رہ گئے۔ تقسیم کے بعد کچھ لوگ DOUBLE MINDED بھی ہوئے۔ پاکستان آئے مگر کچھ عرصے بعد مایوس ہو کر واپس ہندوستان چلے گئے۔

مسلمانوں کے لیے تو ''پاکستان'' نام میں ہی بڑی کشش تھی۔ کراچی دار الخلافہ قرار پا گیا تھا۔ بمبئی سے مہاجروں کے لدے

پھندے بحری جہاز کراچی کے لیے مسلسل روانہ ہو رہے تھے۔ ہندو، مسلمانوں سے خوش خوش اپنی جان چھڑوا رہا تھا۔ یہ مہاجروں کا وہ مفاداتی گروپ تھا جو اپنے ساتھ چڑیاں، طوطے، سل بٹے تک لے کر آ رہا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو کراچی اور اندرون سندھ میں بیٹھے پُرسکون ہندوؤں کو مار بھگانے اور اُن کی جائیدادوں پر قبضے کے منصوبے بنا کر آ رہے تھے کیونکہ قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے بھاری تعداد میں افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے بس یا ٹرین کی ایک سیٹ پر بھی قبضہ کرنا ہو تو آپ کو اپنی چادر اُتار کر اُس پر پھیلانی پڑتی ہے۔ پاکستان سے 10 پیسے کا ننگا پوسٹ کارڈ ہندوستان جاتا تھا: ''بہت جگہ ہے۔ بہت کاروبار ہے۔ بہت نوکریاں ہیں'' اور جواب میں پلے پلائے 10 مہاجرین کراچی آ ٹپکتے تے۔ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ تو کم نظر آتا تھا "MINI HINDUSTAN" زیادہ دکھائی دینے لگا تھا۔ تاریخ گواہ ہے ہندوستان کے حق میں ہر آواز کراچی سے ہی اُٹھی چاہے وہ ''امن کی آشا'' ہو یا '' گاندھی کی بھاشا'' ''جنگ گروپ'' ضیاء الحق کے خوف سے ''اخبار جہاں'' کے ٹائٹل پر بھٹو کی تصویر تو نہ چھاپ سکا مگر ضیاء الحق ہی کو خوش کرنے کی آڑ میں ہندوستانی اداکاروں کی تصاویر ٹائٹل پر شائع کرنے لگا پھر یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ہندوستانی فلموں کی نمائش تک جا پہنچا۔

ہندو کی دور اندیشی کہ اُس نے خیبر پختونخواہ میں خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی) کی صورت میں کانگریس کو بدستور فعال رکھا اور پاکستان کی ناک میں دم کیے رکھا۔ پاکستان میں بم دھماکوں کا آغاز بھی سرحدی گاندھی کی جماعت نے کیا۔

صوبہ سندھ میں ہندوستان نے جی۔ایم سیّد کی صورت میں اپنا بھونپو ڈھونڈ لیا اور رہی سہی کسر پوری کرنے الطاف بھائی بھی آ گئے۔ بلوچستان ایسا مفلوک الحال اور پس ماندہ صوبہ تھا جہاں ہندوستان کا کام سستے میں دو چار سردار خرید کر ہی چل جاتا تھا۔ بوقت ضرورت پوری صوبائی اسمبلی بھی بکنے کو تیار تھی۔

صرف پنجاب اور کشمیر ہی ایسے مقامات تھے جہاں ہندوستان کو خاطر خواہ نتائج نہیں ملے۔ پنجاب میں سکھ ''بفرزون'' یا ''ڈفرزون'' کی حیثیت رکھتے تھے جبکہ کشمیری اول و آخر کشمیری تھے، مسلمان یا ہندو، پاکستانی یا ہندوستانی بعد میں تھے۔ اس طرح پنجاب اور کشمیر میں کانگرس اپنے مفادات کا تحفظ نہ کر سکی اور اُسے بھاڑے کے ٹٹو نصیب نہ ہو سکے اور یہی دو پوائنٹ پاکستانی فوج کے کام آئے۔ مشرقی پاکستان میں کانگرس کی دال خوب گلی۔ وہاں ہندو آبادی کی تعداد مغربی پاکستان کے مقابلے میں خاصی زیادہ تھی اور وہ تدریس جیسے حسّاس شعبے سے منسلک تھے۔ انہوں نے بنگالیوں کو بنگالی ہونے کا خوب احساس دلایا اور پاکستانی نہ رہنے دیا۔ مشرقی پاکستان کا بارڈر بھی برائے نام تھا۔ وہاں کے جغرافیائی معاملات اور حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ بارڈر کی حفاظت مغربی پاکستان جیسی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہاں بارڈر کراس کرنے کی اصطلاح: ''دھکا پاسپورٹ'' کے نام سے مروج تھی۔ مشرقی پاکستان سے جس کسی نے بھی روزگار کے سلسلے میں یا انڈین فلم دیکھنے کے لیے بارڈر پار جانا ہوتا تھا تو وہ بارڈر پر پہنچ کر سنتری کو زیادہ سے زیادہ 5 روپے کا نوٹ تھماتا جس پر وہ مشرقی پاکستان کے شہری کو ہندوستان کی طرف یہ کہتے ہوئے دھکا دے دیتا: ''تم انڈیا کا شہری اِدھر کیا کرنے آیا؟''

پاکستانی بنگالی کی واپسی بھی کم و بیش انہی الفاظ کے ساتھ ہندوستان کی طرف سے اسی طریقے سے ہوتی۔ سنتری اور گشتی میں کوئی فرق نہ تھا۔

ہندوستان کا مقصد مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنا نہیں تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے توڑ کر پاکستان کی طاقت ختم

کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی بنگال میں بھوکے،ننگوں کی کوئی کمی تھی جو وہ مسلمان بنگالی بھی اپنے پیٹے ڈال لیتے۔آج ہوسکتا ہے وہ بنگلہ دیش کی ترقی دیکھ کر جلنے لگے ہوں مگر اندرا گاندھی کی سوچ پاکستانی بنگالیوں کے بارے میں بڑی کلیئر تھی۔

میں ہندوستان جا چکا ہوں۔ جانتا ہوں وہ پاکستان کے نام سے کس قدر الرجک ہیں۔ وہاں کے بازاروں میں کوئی پاکستانی فلم یا گانے فروخت ہوتے نظر نہیں آئیں گے۔ میرے پاس پاکستانی گولڈ لیف سگریٹ کا ڈنڈا تھا جو میں نے جامع مسجد کے پاس ایک پان فروش کو فروخت کیا۔ اُس نے میرے سامنے سگریٹ کی تمام ڈبیاں پھاڑ دیں جن پر MADE IN PAKISTAN لکھا تھا اور سگریٹ ویسے ہی کھلے رکھ لیے۔عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔آپ امپورٹ، ایکسپورٹ لسٹ اُٹھا کر دیکھ لیں۔ ہندوستان، پاکستان سے بیشتر اشیاء وہی خریدتا ہے جن پر پاکستان کی مہر نہ ہو۔ سبزیاں، پھل، سیمنٹ، جپسم، ماربل، چاول، معدنی نمک ایسی اہم مثالیں ہیں۔ نارنگ منڈی کا سُپر کرنل چاول ہندوستان میں دہرہ دون کا چاول کہہ کر فروخت ہوتا ہے۔ ہندوستان نے جاگیرداری کا ٹنٹا تقسیم کے ساتھ ہی ختم کر دیا۔ پاکستان میں اسے ختم کرنے کی سنجیدہ کوشش مسعود کھدر پوش نے "ہاری رپورٹ" پیش کر کے کی اور بعدازاں عیوب خان کو دریا فروشی سے منع کیا تو عیوب خان، مسعود کھدر پوش کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دینے پر اُتر آیا۔ عیوب خان کی مالش چمپی کے لیے اُسی زمانے میں قدرت اللہ شہاب جیسے چاپلوس بیوروکریٹ موجود تھے اسی لیے وہ ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ عیوب خان کے دور میں دو بڑے ڈیم بنے: منگلا اور تربیلا۔ مگر عیوب خان کی ہوشیاری تو دیکھو دونوں بنائے عین پنجاب کے بارڈر پر۔ ڈیم کی جھیل آزاد کشمیر اور خیبر پختونخواہ میں بنادی اور پاور ہاؤس پنجاب کی حدود میں۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ یہ تو اُس بچے جیسا کمینہ پن تھا جو اپنے ہم عمر بچوں کو دکھا دکھا کر آئس کریم کھاتا ہے۔

عیوب خان کا ون یونٹ بنانا بھی قوم کو ایک بنانے کی آڑ میں بہت بڑی سازش تھی۔ ون یونٹ اصل میں مشرقی پاکستان والوں کی عددی اکثریت (ایک کروڑ نفوس کی برتری) کو مغربی پاکستان والوں کے برابر لانے کی حاکمانہ کوشش تھی۔ ان غیر فطری حرکتوں سے پاکستان ٹوٹ گیا۔ عیوب خان کو یہ اعزاز بہرحال حاصل ہے کہ اُس کا گوشت کے منگل، بدھ نانغے والا آرڈر ابھی تک چل رہا ہے۔ کبھی جمہوری یا غیر جمہوری حکومت کی نظر میں نہیں آیا۔ ہوسکا ہے آرڈر والی فائل ہی گم گئی ہو۔ پاکستان کا نقصان ہمیشہ ذاتی اور مفاداتی سوچ کے باعث ہوا۔ اجتماعی یا قومی سوچ کو پروان چڑھنے کے لیے پاکستان کی سرزمین کبھی راس نہیں آئی۔ پاکستان کو ایک گورنر جنرل سکندر مرزا بھی ملا تھا جو میر جعفر، میر صادق کی اولاد میں سے تھا۔ وہ پاکستان میں جمہوریت کے لیے دروازے تو نہ کھول سکا مگر انگلینڈ جا کر ہوٹل کے دروازے آنے والے مہمانوں کے لیے مسکراتے ہوئے کھولتا رہا۔ ایسی بلندی ایسی پستی!

فوجی راشن پر پلا ہوا سانڈ یحییٰ خان اپنے منصبی فرائض پوری کرنے کی بجائے ایوان صدر کے لان میں حسیناؤں کے ساتھ نشے میں دھت ہو کر پکڑن، پکڑائی کھیلتا رہا۔ نامور رقاص فقیر حسین ساگا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک بار لاہور سے طائفہ لے کر اسلام آباد گئے۔ فنکشن کے دوران یحییٰ خان کو طائفے میں شامل کچھ لڑکیاں پسند آ گئیں۔ لائٹ جان بوجھ کر بجھادی گئی۔ لائٹ آئی تو لڑکیاں غائب تھیں۔ فقیر حسین ساگا کو خود اپنی عزت خطرے میں نظر آئی تو باقی ماندہ جنسی طور پر ہراساں طائفے کو لے کر بھاگم بھاگ واپس لاہور پہنچے اور آرٹس کونسل سے طائفے کی وصولی کی رسید لی۔

سانحہ مشرقی پاکستان پر جس طرح میں نے اپنے والد کو زار و قطار روتے دیکھا وہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ دم ہے۔ پاکستان کے لیے یہ ایک جان لیوا آپریشن تھا جس کے بعد بچنے کے امکانات بہت کم تھے مگر اسی مایوسی کی راکھ سے بھٹو نکلا اور بہت کم عرصے میں پاکستان کے لیے اپنی تمام تر مجبوریوں کے باوجود بہت کچھ کر گیا۔ اُس کا ویژن بہت بڑا تھا اسی لیے وہ خود بہت بڑا تھا۔ اُس کو بڑا مطالعے، مشاہدے اور بڑے تعلیمی اداروں اور لوگوں کی صحبت نے بنایا۔ عوام سے رابطہ اور اُن کے اندر اُتر جانا اُس کا وصف اور پلس پوائنٹ تھا۔ فوج تو مذاکرات کی ٹیبل پر اپنی گری ہوئی لاشیں مشکل سے واپس لیتی ہے، بھٹو نے 90 ہزار فوجی جنگی قیدی مکھن میں سے بال کی طرح نکال لیے۔ آئین سے محروم سرزمین کو ایک متفقہ آئین دیا۔ وہ شناختی کارڈ جو پاکستانیوں کو 70 کی دہائی ہی میں بھٹو کی بدولت نصیب ہو گیا تھا ہندوستانیوں کو 1986 تک نہیں ملا تھا۔ میں نے خود ہندوستان میں بہ طور شناختی کارڈ ہندوستانیوں کو میلے کچیلے راشن کارڈ دکھاتے دیکھا تو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا۔ پاکستان کے کرنسی نوٹ اور ڈاک ٹکٹ بھی ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہیں اور پاکستانیوں کا اعلیٰ معیارِ زندگی دیگر اقوام عالم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں چائے جیسی سستی چیز کا میں نے آدھا کپ فروخت ہوتے دیکھا تو اپنی پاکستان دودھ پتی پر رشک آیا۔ چائے فروش چائے کے کپ میں چمچ سے دودھ ڈال رہا تھا اُس کا DROPER کہیں کھو گیا تھا اور چائے کالی کی کالی تھی۔ میں نے چائے کے کالے پن پر بہ طور احتجاج ہندوستان میں چائے نہیں پی۔ دِلّی کی نہاری میں اس قدر مرچیں تھیں کہ مقعد سُلگ اُٹھا۔ گوشت کی جگہ سبزی میں پنیر کے کیوبز نے اس قدر بدمزہ کیا کہ فرائی انڈے تک محدود ہونا پڑا۔ کلکتے سے 10 روز پہلے چلی ہوئی مچھلی دِلّی میں بھلا وہ مزا کہاں دے سکتی تھی جو وہ کلکتے میں دیتی ہوگی اس لیے کھانے میں مزا لینے کی یہ آخری کوشش بھی ناکام رہی۔ وہیں معدے سے آواز آئی: ''بے شک لاہور کا کھانا برصغیر میں بہترین ہے، جس کا کوئی جوڑ اور توڑ نہیں''

پاکستان کو اسلام کے ساتھ لف کر کے ہمیں اُن مسائل کا بار بھی اضافی طور پر اُٹھانا پڑ گیا جو اسلام کو بہ طور مذہب، مذاہب عالم کے مقابلے میں درپیش تھے۔ خرابی نہ پاکستان میں تھی نہ اسلام میں۔ پاکستان کو حکمران نکمّے ملے تھے اور اسلام کو مفسرینِ قرآن و حدیث۔ سکھ ٹھیک ہی تو کہتے تھے: ''جو قوم اپنے گرو کے نواسے اور خود اپنے خلفائے راشدین کو اپنے ہاتھوں مار سکتی ہے وہ ہمارے گروؤں کا کیا پاس، لحاظ کرے گی؟'' ہماری اسلامی تاریخ تو اپنی ابتداء ہی میں ڈگمگا گئی تھی۔ بنگالی انقلابی بھی ہیں اور ہم سے زیادہ سیانے بھی۔ انہوں نے جماعت اسلامی سے جان بھی چھڑوالی اور تفہیم القرآن کو خلیج بنگال کی نذر کر کے، خود روزی، روٹی اور ترقی کی راہ لی۔ اپنی مختصر سی سیاسی تاریخ میں، معیشت کے میدان میں ڈاکٹر یونس جیسا نوبل پرائز ونر پیدا کر لیا جس سے کچھ سیکھنے کی خاطر ایس۔ ایم ظفر کی ہونہار بیٹی روشانے ظفر نے بنگلہ دیش جانے میں کوئی عار نہیں سمجھی۔

ہم اپنی لاعلمی اور نکمّے پن کا اعتراف کریں گے تو کسی سے کچھ سیکھنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔ ورنہ شہباز شریف کی طرح کروڑوں اربوں روپے خرچ کر کے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے سرٹیفکیٹ اکٹھے کرتے رہیں گے۔ بھوک کے ہاتھوں مرتے، روتے، سسکتے پرانے کھلاڑیوں سے پوچھو کہ اُن کی نظر میں گولڈن، سلور، برانز میڈلز شیلڈز اور انعامی ٹرافیوں کی وقعت کیا ہے؟ جو چیز آپ کو عزتِ نفس اور روٹی نہیں دے سکتی وہ آپ کے کس کام کی۔ جو پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں اپنے کھلاڑی دادا، نانا کے انعامی

تحفے بوری میں ڈال کر کباڑیے کے پاس لے کر جائیں گے وہ کس مونہہ سے کھیل کے میدان کا رُخ کریں گے۔ رومن شہنشاہ یہی تو کیا کرتے تھے۔ عوام بھوکے مر رہے ہوتے تھے اور وہ قوم کو کھیلوں کے مقابلے دکھا کر بہلاتے تھے اور بعض کھیلوں میں بڑی چالاکی سے بھوکے لوگوں کو مارنے کا ڈراما بھی کھیلا جاتا تھا۔

شریف برادران بھی سعودی عرب سے شہزادے بن کر ہی واپس لوٹے ہیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ وہاں تو تیل نکلتا ہے اور یہاں صاف پانی بھی اکثریت کو میسر نہیں۔ تعمیرات کا جنون عرب حکمرانوں کو بھی ہے مگر اُن کے پاس پیسہ بے حساب ہے۔ شریف برادران عرب حکمرانوں کا لال مونہہ دیکھ کر اپنے مونہہ قرضوں کے تھپڑ مار مار کر لال کر رہے ہیں۔ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری لینے سے حاصل نہیں ہوتی چاہے وہ ڈگر G.C یونیورسٹی ہی کی کیوں نہ ہو۔

پاکستان میں نعروں کی سیاست تو بہت ہوئی مگر عملی کام کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہمارا گھر نہ سرخ انقلاب بھر سکا نہ سبز انقلاب۔ وجہ؟ موجودہ پاکستان کے ضمیر میں انقلاب ہے ہی نہیں۔ 7up کی بوتل میں نمک ڈال کر تو بہت سے انقلاب پیدا کیے گئے مگر شراب جیسے مستقل سرور والا ایرانی یا فرانسیسی انقلاب پاکستان کے نصیب میں کہاں؟ ثقافت وہ گھاس ہے جو انقلاب پرور زمین میں خود بخود اُگتی اور پوری زمین کو جکڑے رکھتی ہے اور ٹوٹنے سے بچاتی ہے مگر پاکستان کا بیشتر حصہ تو بیرونی حملہ آوروں کی گذرگاہ رہا ہے سینکڑوں سال سے روندی ہوئی جگہ پر ثقافت کی گھاس کیسے اُگے گی؟ ہم تو ہر حملہ آور کو ''خوش آمدید'' کہنے والی قوم ہیں۔ خالص ترین نسلیں تو دو چار ہی یہاں ہوں گی ورنہ باقی سب بیرونی حملہ آوروں کا جھوٹا اور چھوڑا ہوا راشن ہیں۔ پٹھان قبائل جو کبھی رنجیت سنگھ کے دور میں سلطنت پنجاب کا ہی حصہ تھے آپس میں تو بڑھ چڑھ کر NON STOP لڑے مگر بیرونی حملہ آوروں کو ہمیشہ FREE HAND دیا یہاں تک کہ طالبان کو بھی۔ ضیاع الحق نے طالبان غیر ملکی امداد لینے کے لیے فقیروں کی طرح پالے اور مہاجر قومی موومنٹ الطاف بھائی کی زیر قیادت پیپلز پارٹی کو سیاست سے باہر کرنے کے لیے فوجی فیڈر مونہہ میں ڈال ڈال کر پروان چڑھائی۔ ضیاع الحق نے طالبان کو نہ اپنی بیٹی دی نہ بیٹا مگر پورا پاکستان پرایا مال سمجھ کر دے دیا۔ ضیاع الحق وہ فوجی تھا جس نے پاکستان کے چپے چپے کی حفاظت کا حلف تو اُٹھا رکھا تھا لیکن جب اُسے سیاچن پر بھارتی قبضے کی اطلاع چینیوں سے ملی تو شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھٹائی سے کہنے لگا: ''سیاچن پر پر تو گھاس کا تنکا تک نہیں اُگتا'' پاکستانی فوج نے پاکستان کو وسیع اور متحد تو کیا کرنا تھا نااہل جرنیلوں کے باعث اپنے ہی ملک کو فتح کرنے لگی اور کسی دشمن کی طرح بہترین مقامات پر CANTT اور DEFENCE کے نام پر قابض ہو گئی۔ پاکستانی جرنیلوں (حاضر سروس، ریٹائرڈ) کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ فوج کو B.O.T کی بنیاد پر چلا سکتے ہیں مگر حرام خوری کی عادت اکثریت کو روز اول سے ایسی پڑی ہے کہ قومی وسائل آج تک کسی کام کی جگہ پر نہیں لگ سکے۔ فوجی صنعتیں اور ادارے ٹیکس فری ہیں مگر سارا منافع گنے چنے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔ عائشہ صدیقہ نے اپنی کتاب میں فوج کے کمرشل معاملات سے پردہ ہٹایا فوج نے اُسے بھی ADVISOR کی نوکری دے کر قابو کر لیا ورنہ فوج کے پاس دوسرا حل گولی اور تیسرا حل گمشدہ افراد کی فہرست بھی تھا۔ کتاب کا پبلشر بھی OXFORD کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو اُسے بھی I.S.I اُٹھا کر لے گئی ہوتی جیسا ''گوتم'' پبلشر ٹیمپل روڈ، لاہور کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اب ''آزاد پبلشرز'' کے نام سے کیولری گراؤنڈ میں جیسے تیسے کام تو کر رہا ہے مگر ''گوتم'' والی ساکھ تو ختم ہو گئی ناں سکھوں کے

ہتھے چڑھ کر۔ خفیہ ایجنسیوں کے اہل کاروں کو سول سوسائٹی ''سکھوں'' کے نام سے ہی پکارتی ہے جو ہے تو سکھوں جیسی معزز قوم کے ساتھ زیادتی مگر یہ نام عوامی سطح پر ایسے ہی لیا جاتا ہے۔

پاکستان میں جیسی موسموں کی ورائٹی ہے۔ سبزیوں، پھلوں کی بہتات ہے۔ آمدورفت کی سہولتیں مناسب ہیں اُس حساب سے تو سیاحت کو ہماری قومی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا مگر راشی جرنیلوں نے کیا کیا۔ ایبٹ آباد جیسے پُرفضا مقام پر اُسامہ بن لادن کو بمعہ اہل وعیال لا بٹھایا اور سوات، کالام میں طالبان کی میزبانی شروع کردی۔ غیر ملکی سیاح تو دور کی بات ملکی سیاح بھی ان علاقوں میں جانے سے بھاگ گئے۔ وہ علاقے جن کا زیادہ تر انحصار ہی سیاحت پر تھا، بھوکے مرنے لگے، خوبانی اور آڑو سے کہاں تک پیٹ بھرتے۔ دور انگریز کا ہو یا کالے انگریز کا مارا ہر دور میں غریب ہی گیا ہے۔ اکتوبر 2005 میں آزاد کشمیر میں جو تباہ کن زلزلہ آیا تھا جس میں اسّی نوے ہزار ہلاکتیں ہوئی تھیں میرا خیال تھا اس قدرتی آفت نے بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں کیا ہوگا مگر اس میں بھی آزاد کشمیر کی اعلیٰ قیادت ہمیشہ کی طرح بچ نکلی کیونکہ وہ اسلام آباد میں SAFE & SOUND بیٹھی تھی۔ پنجابی کا محاورہ ہے: ''بھینسیں، بھینسوں کی بہنیں ہوتی ہیں'' بڑا، بڑے کا لحاظ کرجاتا ہے مگر چھوٹے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ آپ امریکہ کے جاپان پر ایٹم بم پھینکنے کو ہی لیں۔ اصل دشمن جرمنی (یورپ) تھا مگر بم ایشیا میں لا کر پھینکا اور وہاں بھی جاپانی شہنشاہ (ٹوکیو) کو بچاتے ہوئے ہیروشیما اور ناگاساکی کا انتخاب کیا۔

معروف دانشور ڈاکٹر مہدی حسن نے ایک فوجی بریفنگ کی بات بتائی جہاں ایک مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو بہ طور خاص کہا: ''ڈاکٹر صاحب لگتا ہے آپ نے کبھی شہید کے چہرے پر پھیلا نور نہیں دیکھا، اسی لیے آپ جہاد کی مخالفت کرتے ہیں'' ڈاکٹر صاحب کا جواب بریفنگ میں موجود تمام افراد کو چُپ کروا دینے والا تھا:

''مولانا صاحب میں آپ کے چہرے پر بھی ویسا ہی نور دیکھنا چاہتا ہوں''

بات تو ایسی ہی ہے مُلّا نے ہر سائنسی ایجاد کو پہلے پہل شک کی نظر سے دیکھا، پھر اُس کی زوروشور سے مخالفت کی اور اُس کے بعد اُسی ایجاد کا سب سے بڑھ کر فائدہ بھی اُٹھایا۔ لاؤڈ سپیکر جسے مُلّا شیطان کی آواز کہتا تھا سے بڑھ کر اور مثال کیا ہوگی۔ مُلّا کو فوج کی راہ ضیاء الحق نے دکھائی۔ فوجی کمپنیوں کے نام الفا، بریوو، چارلی ہوا کرتے تھے۔ تختہ اُلٹنے کی مہم کا نام ''مڈنائٹ جیکال'' تھا۔ پھر فوجی مشقوں اور مہارت کے نام ''ضربِ مومن''، ''ضربِ عضب'' رکھے جانے لگے مگر فوج کا امیج تمام تر اخراجات اور اشتہاری مہم کے باوجود ویسے کا ویسے ہی رہا کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ پاکستان کی ضرورت فوج ہے مگر اب لگتا ہے کہ فوج کی ضرورت پاکستان ہے۔ اسی بات کو حسن نثار نے کچھ ایسے انداز میں بیان کیا: ''جب میں چھوٹا تھا تو پاکستان بڑا تھا جب میں بڑا ہوا تو پاکستان چھوٹا ہو گیا''

جب پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام پر کام کر رہا تھا تو ہمارا اور امریکی موقف دنیا کے لیے یہ تھا کہ یہ پُرامن مقاصد کے لیے ہے۔ ہمارے دھماکے کر دینے کے بعد شکر ہے دنیا نے ہم سے نہیں پوچھا کہ آپ کے وہ پُرامن مقاصد کیا ہوئے؟ پُرامن ایٹمی پروگرام میں ایٹمی بجلی بھی شامل ہوتی ہے۔ ایٹمی پاکستان لوڈ شیڈنگ کا عذاب کیوں بھگت رہا ہے؟ کہوٹہ میں ایٹمی سائنسدانوں کی فوج اب کیا کام کر رہی ہے اور اُس کے فوائد عوام کے سامنے کیوں نہیں آ رہے؟

پاکستان اتنا مجبور اور لاغر ہے نہیں جتنا اس کو عالمی امداد کھانے کی خاطر دنیا کے سامنے ظاہر کیا جاتا ہے۔جس طرح موبائل کمپنیوں سے 4G،3G کی بولی اربوں میں لی جاتی ہے۔اسی طرح اب وقت آ گیا ہے کہ الیکشن کے موقع پر تمام بڑی سیاسی پارٹیوں سے بھی بولی دلوائی جائے۔اسی طرح ملک سے باہر یورپی بنکوں میں پڑا جرنیلوں اور سیاست دانوں کا سرمایہ واپس ملک میں آئے گا۔اس کے علاوہ قانون سازی کی جائے کہ کسی بھی پاکستانی کا جو وفات پا جائے اُس کا بیرون ملک خفیہ یا علانیہ اکاؤنٹ کا بیلنس حکومت پاکستان کے اکاؤنٹ میں TRANSFER کیا جائے گا۔اس طرح پاکستان کو وہ پیسے واپس مل جایا کریں گے جو پاکستانی عوام ہی سے لوٹ کر بیرون ملک پہنچائے گئے تھے۔ایسا کیے بغیر پاکستان کی حقیقی بہتری کا کوئی چانس نہیں۔ورنہ نعرہ لگانے کو تو آج بھی لگایا جا سکتا ہے۔ہم 1970 کی قیمتیں واپس لائیں گے!

مرزا ریڈ اینڈ وائٹ

انگریزی محاورے کے مطابق کسی بات یا معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے In Black and White کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ رنگین تصاویر سے پہلے تصاویر اور فلمیں بھی بلیک اینڈ وائٹ ہوا کرتی تھیں۔ وکیل بھی بلیک اینڈ وائٹ ہوتے ہیں لیکن ریڈ اینڈ وائٹ کیا ہے؟ یہ ہے میری دلپسند شخصیت ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا پسندیدہ سگریٹ برانڈ۔ فیض احمد فیضؔ، احمد فرازؔ اور عطاء الحق قاسمی نے اپنی بے تکان سگریٹ نوشی کے باعث گولڈ لیف سگریٹ کو جو عظمت عطا کی وہ سب ایک طرف لیکن اپنے مرزا صاحب نے ریڈ اینڈ وائٹ کے ساتھ اب تک جو نباہی ہے وہ ایک الگ کہانی اور اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ریڈ اینڈ وائٹ سگریٹ کمپنی مرزا صاحب کے ہوتے ہوئے کبھی خسارے میں نہیں جاسکتی جو اُن کے Un Official سفیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ریڈ اینڈ وائٹ والوں نے ایک مرتبہ انعامی سکیم لانچ کی تھی اس انعامی سکیم کا احترام مرزا صاحب نے رمضان المعروف ماہِ صیام سے کہیں بڑھ کر کیا اور سگریٹ نوشی کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ انہی دنوں امریکہ کی ریاست ورجینیا میں سگریٹ نوشی کا ورلڈ کپ بھی ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب پاکستان سے اس ورلڈ کپ کے لیے کوالیفائی تو بآسانی کر گئے لیکن اُن کے محکمے کی طرف سے انہیں چھٹی نہیں ملی یوں پاکستان ایک عالمی اعزاز سے محروم کر دیا گیا۔ مرزا صاحب کی شخصیت بھی کسی حد تک ریڈ اینڈ وائٹ کہی جاسکتی ہے کیونکہ وہ نظریات کے لحاظ سے سُرخے ہیں لیکن اگر کوئی انہیں دلیل (جس کا امکان کم ہی ہوتا ہے) سے قائل کر لے تو وہ سفید بھی ہو جاتے ہیں یعنی اُن کے ہاتھ میں امن کا سفید جھنڈا لہرانے لگتا ہے۔ یہ تو تھی بالمشافہ ملاقات کی حد تک صورت حال ورنہ جس کا تعارف مرزا صاحب سے صرف تحریروں کی حد تک ہو تو وہ مرزا صاحب کو ہٹلر نہیں تو کم از کم موسولینی ضرور سمجھے گا۔ کوئی موضوع یا شخصیت تنقیدی سطح پر اُن کے ہتھے چڑھ جائے تو پھر وہ اُسے انو کی لاک لگائے بغیر نہیں رہتے۔ اُن کی شہرت میں اُن کے دوستوں سے زیادہ اُن کے دشمنوں کا حصہ ہے جو اُن پر مضامین لکھنے کو ناکافی سمجھتے ہوئے کتابیں لے کر آئے اور لکھتے لکھتے مر گئے۔

ریڈ اینڈ وائٹ سگریٹ کے بعد اُن کی شخصیت کا لازمی حصہ اُن کی مزدا Mazda کار نمبر RIF-77 ہے جس کی تاریخ پیدائش تو مجھے معلوم نہیں لیکن اُس سے وابستہ تاریخی کہانی ضرور یاد ہے۔ یہ وہ تاریخی گاڑی ہے جو ''شبنم ڈکیتی کیس'' کے ملزمان نے ڈکیتی کے سلسلے میں جنرل ضیاء کے دور میں استعمال کی تھی۔ اس گاڑی کو مرزا صاحب آج بھی اُسی فخر کے ساتھ چلاتے ہیں جیسے ساتھ کی سیٹ پر اداکارہ شبنم براجمان ہو۔ انہوں نے اس گاڑی کو نئی گاڑی کے ساتھ تبدیل کرنے کی لاتعداد اپیلیں اُسی سفاکی کے ساتھ مسترد کیں جس سفاکی کے ساتھ جنرل ضیاء نے بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے مسترد کی تھیں۔ جنرل ضیاء کی اس شقاوتِ قلبی کا نتیجہ تو پاکستان آج تک عرب ممالک (بالخصوص لیبیا اور شام) کے ساتھ زوال پذیر تعلقات کی صورت میں بھگت رہا ہے بلکہ چین بھی آج پاکستان سے زیادہ بھارت کے قریب ہو چکا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کو اپنی تاریخی کار کے حوالے سے اپیلیں مسترد کرنے کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا یا پھر انہوں نے اپنے مضبوط اعصاب کے باعث ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مرزا صاحب نے اپنی کار کو جس طرح آج تک چلایا ہے یہ اُنہی کا خاصہ ہے۔ پہلے انہوں نے اس کار کو پیٹرول سے ڈیزل میں تبدیل کروایا اور پھر اُسے نیو ملینیم کے تقاضوں سے

ہم آہنگ کرنے کی غرض سے اس میں CNG کٹ لگوائی اور مستقبل قریب میں اُسے قمری توانائی پر چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب کی گاڑی کی صورت بے شک اچھی نہ سہی اُس کی سیرت کا میں بھی قائل ہوں کہ درجن بھر سے زیادہ مرتبہ اُس میں سفر کر چکا ہوں لیکن ایک مرتبہ بھی (میری خوش قسمتی سے) خراب نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے اس میں میری ذاتِ بابرکات کا بھی دخل ہو۔ مرزا صاحب کی گاڑی بارانی ہے یعنی وہ باران کی صورت میں دُھلتی ہے۔ اگر اُن کا گھر نہر کنارے ہوتا تو یہ لازماً بارانی کی بجائے نہری ہوتی۔ چونکہ مرزا صاحب کا تعلق اٹک یعنی بارانی علاقے سے ہے تو اُن کی گاڑی کا بارانی ہونا ہی فطرت سے قریب تر ہے۔ اپنے اہل خانہ کے بعد سب سے زیادہ وقت مرزا صاحب نے اپنی اسی گاڑی کو دیا ہے غالباً اسی وجہ سے گاڑی سے حسد کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کسی بھی شخصی خاکے کی خاص بات ممدوحہ شخصیت کا ناک نقشہ بھی ہوتا ہے۔ مرزا صاحب اپنی تصویر چھپوانے کے زیادہ قائل نہیں جبکہ میں بھی اپنی تخلیقات میں ہیرو ہیروئن کا سراپا بیان کرنے کا زیادہ تردد نہیں کرتا اُسے قاری کے تخیل اور اللہ کی آس پر چھوڑ دیتا ہوں۔ مرزا صاحب کے ضمن میں بھی صرف اتنا کہوں گا کہ وہ دیکھنے میں بالکل ایسے لگتے ہیں جیسے جنرل پرویز مشرف بغیر وردی کے تمام عہدوں سے دستبردار ہونے کے بعد غیر فعال حیثیت سے گھوم پھر رہا ہو۔ میں نے اس مشابہت کے باعث ایک بار جان کی امان پاتے ہوئے اُن سے عرض کیا: ''آپ بے خوف و خطر جہاں مرضی جائیں لیکن فاٹا (بالخصوص وانا) کے علاقے میں جانے سے گریز کریں وہاں آپ کو سیلوٹ کی بجائے کچھ اور ہی پڑے گا جو راکٹ یا میزائیل سے کم تر درجے کی چیز نہ ہوگی''

مرزا صاحب یوں تو Ph.D ڈاکٹر ہیں لیکن ملاقاتیوں کو ضرورت پڑنے پر بڑے اعتماد کے ساتھ طبی مشورے دینے کے ساتھ ساتھ نسخہ جات بھی لکھوا دیتے ہیں۔ چونکہ لوگ مفت میں ملنے والے مشوروں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے اس لیے مرزا صاحب کی یہ پریکٹس کچھ زیادہ نہیں چل پائی جیسی ممتاز مفتی جیسے ٹھرکی کی چلی تھی البتہ افسانے کے میدان میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور افسانے کی ختنہ ہو یا عقیقہ سالگرہ ہو یا بسم اللہ ہر جگہ مرزا صاحب کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب نے ''اُردو افسانے کی روایت'' اور ''اُردو ترجے کی روایت'' کے نام سے کتابی صورت میں جو کام کیا ہے وہ اکیلا ہی انہیں اَدبی تاریخ میں زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ یہ اُن کی ادبی شخصیت کی ایک جہت ہے ورنہ وہ بطور تخلیق کار بھی کسی سے کم نہیں۔ اُن کی ''تار پہ چلنے والی'' ابھی تک نیچے نہیں اُتری۔ انہوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنا رکھی ہے اور فنون لطیفہ پلس متحرک لطیف نرم و نازک چیزوں پر بھی اُن کی میٹھی نظر رہتی ہے۔ میرے نزدیک اُن کی شخصیت کا مثبت ترین پہلو اُن کی سخت محنت اور انسان دوستی ہے۔ وہ اپنے سے بڑے کا لحاظ کرنے میں بے شک کوتاہی کر جائیں لیکن اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اُن کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ وہ جس کے دوست بن جائیں اُس پر اپنا سب کچھ وار دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور شاید دشمنی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک اعلیٰ پولیس افسر کے فرزند تھے انہوں نے اپنا راستہ خود تلاش کیا اور اپنے والد کے نام سے یا سر پیرزادہ کی طرح کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ انہوں نے ''سلیم'' کے فرضی نام سے مشہور ناول نگار رحیم گل (جو فلمی ہدایتکار بھی تھے) کے ساتھ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا اور جیب میں وافر پیسے نہ ہونے کے باعث اورینٹل کالج ہوسٹل سے شاہ نور سٹوڈیو تک پیدل آتے جاتے رہے۔ انہوں نے جن گنی چنی کتابوں کے دیباچے لکھے اُن میں خوش قسمتی سے میری کتاب ''شہاب نامہ کی حقیقت'' بھی شامل ہے۔ کتاب کا ابتدائیہ لکھوانے کے

سلسلے میں میری مرزا صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی جو بعد میں دوستی اور گھریلو سطح کے تعلقات میں تبدیل ہوگئی۔ مرزا صاحب اور میرا سٹار ایک ہی ہے یعنی Virgo سنبلہ۔ اس لیے ہمارے مزاج بھی خاصی حد تک ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مرزا صاحب نے میری کتاب ''شہاب نامہ کی حقیقت'' کا ابتدائیہ لکھنے میں پورا ایک سال لیا اور کتاب شائع ہونے کے بعد یہی ابتدائیہ میری کتاب کا حاصل قرار پایا۔ اس ابتدائیے کو لکھنے کی وجہ سے بہت سے لوگ مرزا صاحب سے ناراض بھی ہوئے اور انہوں نے نقصانات (تفصیلی ذکر کسی اور موقعے پر کیا جائے گا) بھی اُٹھائے لیکن اپنے لکھے پر قائم رہے ورنہ بہت سے فلیپ نگاروں کی عادت ہے کہ اگر کوئی بات اُن پر اُلٹی پڑے تو ایسے نہیں ایسے تھا۔ کہہ کر اپنے لکھے سے بھی مکر جاتے ہیں یا مولانا مودودی کی طرح تشریح و تفہیم کے نام پر گھپلا کر جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے مغل ہونے کی لاج اب تک رکھی ہوئی ہے اور خاندانِ مغلیہ کی یادگار کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں ایک غیر فعال سی تلوار لٹکا رکھی ہے جس پر انسانی خون تو درکنار کسی برائلر مرغی کے خون کا دھبہ تک نہیں۔

مرزا صاحب اگر موڈ میں ہوں تو پھر اُن سے باتوں کے دوران شام کس طرح رات میں اور رات کس طرح صبح میں ڈھل جاتی ہے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ صرف اپنی ہی نہیں سناتے اپنے سامع کو بھی برابر کا موقع دیتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ سامع اپنے حصے کا وقت بھی بخوشی اُنہیں بخش دیتا ہے کیونکہ اُن کا علمی بہاؤ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کچھ باتیں بظاہر کڑوی اور ناقابل فہم ضرور لگتی ہیں مگر اُن کے قد کاٹھ کا پتہ بھی دے جاتی ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر انور سدید کو باقاعدہ رجسٹرڈ ڈاک سے خط بجھوایا اور اُس میں درخواست کی کہ اُن کا نام کسی ادبی جائزے یا مضمون میں شامل نہ کیا جائے وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ کراچی کے افسانہ نگار اور ناول نگار اے۔ خیام نے افسانوں کے انتخاب ''ہمعصر اُردو افسانہ (50 نمائندہ افسانے)'' میں اُن کا افسانہ شامل کیا تو اُلٹا اُن سے ناراض ہوئے۔ غلام حسین ساجد نے اُن کی ''گولڈن جوبلی تقریبات'' اپنا سب کچھ لُٹا کر منانے کی مخلصانہ آفر پُرزور اصرار کے ساتھ کی مگر مرزا صاحب اس جھانسے میں بھی نہیں آئے کیونکہ انہیں AFTER EFFECTS کا پتہ تھا کہ بعد میں غلام حسین ساجد اُن کے ساتھ بلا جواز ہندوستان جانے کی ٹھان لے گا۔ واہگہ بارڈر پر جا کر لیٹ جائے گا اور زمین پر ضدی بچے کی طرح ایڑیاں مار مار کر ملٹی پل ویزا لگوانے کی ضد کرے گا۔ اگر وہاں سے مستنصر حسین تارڑ کے بیٹے سمیر تارڑ نے لفٹر سے اُٹھوا بھی دیا تو ایئرپورٹ پر جا کر دھرنا دے گا۔ مرزا صاحب میں بھی وہ قدرتی اکڑ پائی جاتی ہے جو ہر اُس باپ میں ہوتی ہے جو صرف بیٹوں کا ہی باپ ہو۔ غلام حسین ساجد، خالد اقبال یاسر اور عطاء الحق قاسمی ایسی ہی مثالیں ہیں۔ مرزا صاحب کی انفرادیت اس معاملے میں یہ بھی ہے کہ خدا نے انہیں ڈاکٹر فواد بیگ کی صورت میں ایسا تابعدار اور شریف بیٹا دیا ہے جو T.V پروڈیوسر ہونے کے باوجود بے داغ کردار کا مالک ہے۔ خالد قریشی (اورینٹ پبلشرز) جو مرزا صاحب اور میرے مشترکہ دوست ہیں ہم مرزا صاحب کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر فواد بیگ کے حوالے سے ایک فرضی قصہ بنا کر خوب انجوائے کیا کرتے ہیں۔ مذاق بھی تو شریف آدمی کا ہی اُڑایا جاتا ہے کسی بدمعاش کا نہیں۔ میرا اور خالد قریشی کا تخلیق کردہ قصہ کچھ یوں ہے: مرزا صاحب تھکے ہارے کالج سے گھر واپس آتے ہیں، گھر میں ڈاکٹر فواد بیگ (فادی) کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ جیسے ہی مرزا صاحب گھر میں داخل ہوتے ہیں تو دروازہ کھولتے ساتھ ہی فادی اپنے ابو سے لپٹ جاتا ہے اور ہچکیاں لے لے کر روتا ہے۔ مرزا صاحب شدید پریشانی

کے عالم میں پوچھتے ہیں: ''بتاناں فادی آخر ہوا کیا؟'' فادی بڑی مشکل سے انہیں روتے روتے بتاتا ہے: ''ابو میں لُٹ گیا''۔'' کیسے؟ کس کے ہاتھوں؟'' مرزا صاحب کو ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔''ابو وہ SURF EXCEL بیچنے والی لڑکیاں ہیں ناں مارکیٹنگ والی جو لیور برادرز نے چھوڑ رکھی ہیں۔اُن میں سے ایک آئی تھی اور میرے اکیلے ہونے کا فائدہ اُٹھا کر مجھے لُوٹ گئی۔'' ہم دونوں یہ واقعہ اُردو بازار میں قریشی صاحب کی دکان پر ایک دوسرے کو تمثیلی انداز میں سُنا کر بہت لطف اُٹھاتے رہے۔ مذاق اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نہ تو شریف برادران کی شرافت کی گواہی دے سکتا ہوں نہ ہی اپنے بچوں کی مگر ڈاکٹر فواد بیگ (فادی) کی شرافت ایسی مسلّمہ ہے کہ اُس کے حوالے سے میں کوئی دوسری بات نہ سوچ سکتا ہوں نہ ہی سُن سکتا ہوں۔

مرزا صاحب سے پہلے ڈاکٹر سلیم اختر میرے ادبی اور بزرگ دوستوں میں قریب ترین تھے۔ مرزا صاحب سے دوستی کے بعد یہ رینکنگ کسی قدر تبدیل ہو گئی۔ میرے دماغ میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے حوالے سے ایک شرارتی سا سوال اکثر ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اب بھی جنسی طور پر فعال ہوں گے؟ یہ سوال پوچھنے کی ہمت مجھے نہ پڑی و میں نے ڈاکٹر مرزا صاحب سے اس خلش کا ذکر کیا۔ قبولیت کی گھڑی (رات ڈیڑھ بجے) تھی مرزا صاحب نے اُسی وقت ڈاکٹر سلیم اختر کو لینڈ لائن پر فون ملا دیا۔ خاصی گھنٹی بجتی رہی آخر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے فون اُٹھا ہی لیا۔ مرزا صاحب نے چھوٹتے ہی کہا: ''ڈاکٹر صاحب آج کل وی کھڑ کاندے او؟'' ڈاکٹر سلیم اختر نے نیند خراب ہو جانے کی وجہ سے جلا بھنا جواب دیا: ''مرزا صرف اے پچھن لئی ای فون کیتا سی؟ عقل نوں ہتھ مار۔ میں تے آپ کھڑ کیا پیا واں'' اور فون بند کر دیا۔ یہ بات جب کبھی یاد آتی ہے میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے کیونکہ میں نے صرف فوٹو گرافر کے کہنے پر مسکرانا نہیں سیکھا۔

سگریٹ اور کار کے بعد اُن کی تیسری محبت چائے ہے۔ کون سے برانڈ کی؟ اس معاملے میں میری لاعلمی معاف کی جائے۔ ویسے بے دریغ چائے پینے والے برانڈ کی کچھ زیادہ پرواہ بھی نہیں کرتے شاید یہی معاملہ مرزا صاحب کے ساتھ بھی ہو۔ بڑے مرزا صاحب (مرزا غالبؔ) تو کچھ اور پینے کے شوقین تھے۔ چائے پینا اور ہر موسم میں پینا مرزا صاحب کا شوق ہے اور آج یہ شوق ایسا قومی شوق بن چلا ہے کہ کوئی زیادہ معترض بھی نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ چائے میٹھے کے ساتھ پیے گا یا پھیکی۔ چائے کی نشست پر میں نے مرزا صاحب کی ایک چالاکی ضرور نوٹ کی ہے اور وہ ہے خود کم سے کم کھانا اور مہمان کو زیادہ سے زیادہ کھلانا۔ ورنہ خدالگتی کہوں تو اپنی حالت یہ ہے کہ گھر میں پکوا تا مہمان کے نام پر ہوں لیکن مہمان سے کہیں زیادہ خود کھا جاتا ہوں جبکہ مرزا صاحب صرف کھانے کا ایکشن دیتے ہیں اور مہمان یہی سمجھتا ہے کہ وہ سچ مچ کھا رہے ہیں اور اسی چالاکی کے باعث وہ اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ سمارٹ ہیں جبکہ ہم جیسے اُن سے جونیئر ہوتے ہوئے بھی دیکھنے میں اُن کے برابر نظر آتے ہیں۔ ساٹھ کے پیٹے میں خود کو سمارٹ رکھنا بڑے فخر اور کمال کی بات ہے اور یہ اعزاز مرزا صاحب ہی کو حاصل ہے۔ ورنہ صحت کی حدود کراس کرنے والوں میں عطاء الحق قاسمی اور اصغر ندیم سیّد کے جمبو سائز بوتھاڑ گواہی دیتے ہیں اُن کی حرام خوری کی۔ سنا ہے سمارٹ رکھنے میں سگریٹ اور چائے بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی بھوک مار دیتے ہیں لیکن یہ دونوں اشیاء تو بہت سے دوسرے لوگ بھی اسی توازن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ وہ سب کیوں سمارٹ نہیں؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب خود کو سمارٹ رکھنے کے لیے خصوصی محنت کرتے ہیں۔ گاڑی ہونے کے

باوجود اکثر پیدل بھی چلتے ہیں۔کبھی کبھار اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ اپنے گھر (علامہ اقبال ٹاؤن) سے ویگن پر بھی چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک میں اُن کے معمولات سے واقف ہوں وہ رات ایک دو بجے تک جاگتے بھی ہیں۔ٹی وی دیکھنے کے لیے نہیں، تصنیف و تالیف کی غرض سے یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی جوانی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔البتہ اُن کے گھنے سیاہ بال مجھے کبھی کبھی شک میں ضرور ڈال دیتے ہیں۔ جو اس عمر میں کم از کم بلیک اینڈ وائٹ ضرور ہونے چاہئیں۔جنہیں وہ صدفی صد اصلی قرار دیتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ وہ غلام حسین ساجد مارکہ ہیئر کلر استعمال کرتے ہوں جس کے کالے ہونے میں کسی کو شک نہیں۔اُن کے تمغۂ امتیاز کی راہ میں ''افتخار'' حائل تھا اور اُن کی سرکاری نوکری کی راہ میں ''قریشی'' مگر حق دار کو حق مل کر رہا۔خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔انڈیا کا ملٹی پل ویزا لگوانے اور لاہور ٹرانسپورٹ کمپنی LTC کا مفت سفری کارڈ بنوانے کے لیے 65 سال کے ہوجانے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔اپنے باقی ارمان ریٹائرمنٹ سے پہلے پہلے پورے کر چکے ہیں۔''تاج محل'' کی اعزازی چوکیداری کرنا چاہتے تھے مگر ''تاج محل'' کو شک پڑ گیا کہ موقع پاتے ہی چوکیدار، بم بلاسٹ کر دے گا۔یہی ایک حسرت ہے جس کے باعث ایک سرد ''آہ'' اُن کے مونہہ سے اکثر نکل جاتی ہے!

مستنصر حسین تارڑ......اک پاکستانی یونانی یونانی سا

مستنصر حسین تارڑ کی پیدائش یکم مارچ 1939 کو بیک وقت گکھڑ منڈی اور لاہور کے مقام پر ہوئی۔طبّی تاریخ کا یہ اکلوتا، انوکھا اور منفرد واقعہ غیر منقسم ہندوستان میں پیش آیا۔تارڑ کے والد چوہدری رحمت خان تارڑ بھی فور ان ون تھے۔ وہ چوہدری بھی تھے، خان بھی تھے، رحمت بھی تھے اور تارڑ تو وہ بہرصورت تھے ہی۔ وہ اپنے موقع پرست بیٹے کے لیے کس قدر آپشن چھوڑ گئے تھے۔ کوئی مانے نہ مانے مستنصر حسین تارڑ کی ولادت باسعادت ڈیلوری کی حد تک نارمل مگر باقی ہر لحاظ سے ابنارمل تھی۔ اُن کی پیدائش پر حکومت یونان نے 10 منٹ کی خاموشی کا باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کیا جو FAX کی ایجاد نہ ہونے کے باعث ابھی تک حکومت پاکستان کو باضابطہ طور پر موصول نہیں ہوسکا۔ بعض محققین از قسم امجد طفیل اُن کی پیدائش ''جوکالیاں'' کی بھی بتاتے ہیں۔ جس بندے کی پیدائش اتنے اسرار کی حاملہ ہو اُس کی وفات کیا ترفاٹ مچائے گی؟ یہ اندازہ لگانا کچھ ایسا دشوار بھی نہیں۔ اُن پر کام کرنے والے بلکہ اُن کا کام تمام کر دینے والے محقق لیکچرر احمد بخش (فخرِ رحیم یارخان) کے مقالے سے ہی ہمیں پتہ چلا کہ مستنصر حسین تارڑ میٹرک سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ یہ مقالہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کی موجودہ صدرِ شعبہ اُردو، ڈاکٹر روبینہ ترین کی زیر نگرانی مکمل ہوا۔ احمد بخش نے تارڑ کو واسطے دیئے، ترلےمنتیں کیں اور گوڈوں سے کچھ اوپر ہاتھ بھی لگایا مگر تارڑ سرٹیفکیٹ یا ڈگری کے نام پر مزید کچھ نہ دکھا سکے حالانکہ اب تو بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اسلم رئیسانی نے ڈگری کا رولا ہی مُکا دیا ہے یہ بیان دے کر: ''ڈگری، ڈگری ہوتی ہے چاہے وہ اصلی ہو یا نقلی'' ملک احمد بخش اپنی تحقیقی حس سے مجبور ہو کر تارڑ کے جڑوں کی تلاش میں ''جوکالیاں'' بھی گئے مگر جب انہوں نے جوکالیاں سُپر ہائی وے پر لگا یہ انتباہی بورڈ دیکھا: ''یہاں سؤر اور تارڑ پائے جاتے ہیں۔ از حد محتاط رہیں!'' سور سے کون نہیں ڈرتا، جان کس کو پیاری نہیں ہوتی اس لیے ملک احمد بخش اپنے تھیسس پر لعنت بھیجتے ہوئے واپس رحیم یارخان لوٹ آئے۔ ملک احمد بخش کو ہم رحیم یارخان ہی میں چھوڑتے ہیں اور آتے ہیں تارڑ کی طرف۔ میری تحقیق کے مطابق یونانیت کے وسیع ذخائر قبل از تارڑ متحدہ ہندوستان میں ''جوکالیاں'' (موجودہ پاکستان) کے مقام پر ہی دریافت ہوئے تھے اور ان ذخائر کا بیشتر حصہ اکیلے تارڑ کے حصے میں آیا۔ باقی تارڑ قوم بوجوہ یونانیت سے محروم رہی۔ تھوڑی بہت یونانیت احمد عقیل روبی نے بھی لیز پر لی۔ میری اس بات کی تصدیق احمد عقیل روبی بھی ''بزبانِ قاسمی'' کر چکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تارڑ کا 'یونانی' ہونا زیادہ اہم ہے یا پاکستانی ہونا؟ تو ہم تارڑ کے یونانی ہونے کو فریزر میں ڈالتے ہوئے اُن کے پاکستانی ہونے پر بات کرتے ہیں۔

کتاب: ''پنجاب کی ذاتیں'' کے مصنف سر ڈینزل ابسٹن، تارڑ قوم کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں: ''انتہائی سست، آوارہ گرد اور شورش پسند'' تارڑ کے بھی قریب قریب وہی کمپلیکسز ہیں جو ہر پاکستانی کے ہیں۔ تارڑ چونکہ مقامی تھے اس لیے الاٹمنٹس کی لوٹ مار میں انہیں یا اُن کے خاندان کو کچھ خاص بھنڈارا نہ ملا۔ اس دُکھ کا اظہار وہ اپنے ہر ملاقاتی سے کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور اکثر اس غم کو غلط کرنے کی خاطر احتجاجی طور پر ملک چھوڑ جاتے ہیں مگر ملک سے غیر حاضری کو الطاف حسین المعروف بھائی جان کی طرح CASH کرواتے ہیں اور اُسے اپنی طرف سے ''سفرنامے'' کا نام دیتے ہیں۔ اُن میں وہ سادگی، تمام تر خرانٹ پن کے

باوجود پائی جاتی ہے جسے کوئی دیہاتی یا مضافاتی کسی بڑے شہر میں سیٹل ہونے کے باوجود نفی نہیں کرسکتا۔ تارڑ کو کوئی بڑا خاندانی بیک گراؤنڈ نہ ہونے کی کمی اپنے والد کی چند کلے زرعی اراضی چاندی کے ورق کی طرح کوٹ کوٹ کر سینکڑوں مربعوں پر پھیلا کر پوری کرنی پڑتی ہے۔ ایک بار غلام حسین ساجد کے سامنے تارڑ نے ایسی ہی لپاڑ بازی کا مظاہرہ کیا تو غلام حسین ساجد تمام تر احترام کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے: "تارڑ صاحب رُک جائیں آپ کی زمینیں تو بارڈر کراس کر گئی ہیں"

تارڑ کو اپنے والد میں ملک خدا بخش بُچہ جیسے خواص ڈالنے پڑتے ہیں اور اُن سے بھی بڑا زرعی ماہر ثابت کرنا پڑتا ہے اور اُن کے سبزی، پھلوں، پھولوں کے حوالے سے "نظریہ ضرورت" کے تحت لکھے ہوئے کُتا بچے سنگ میل پبلی کیشنز جیسے معتبر اشاعتی ادارے سے چھپوانے پڑتے ہیں جو خود سنگ میل کا اعتبار مونہہ کے بل زمین پر گراتے ہیں۔ تارڑ کے کلاس فیلو ریٹائرڈ پروفیسر مظہر (حالیہ مقیم ٹاؤن شپ، لاہور) اُن کی تعلیمی کارکردگی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "تارڑ کو ناقص تعلیمی کارکردگی کے باعث مشن سکول، رنگ محل، لاہور نے کلنک کا ٹیکا سمجھتے ہوئے مسلم ماڈل سکول، اُردو بازار، لاہور کی راہ دکھائی، جہاں سے انہوں نے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر کے پوری تارڑ قوم کی لاج رکھ لی" یہ تو بعد کی بات ہے کہ اس قوم سے رفیق تارڑ، میاں محمد شریف کو جملہ اقسام کے لطائف سنا سنا کر صدرِ پاکستان منتخب ہوئے مگر جس انداز سے ایوانِ صدر سے رخصت ہوئے وہ بقول میر تقی میرؔ: "جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے" والا معاملہ تھا۔ تارڑ قوم کی عزت، بے عزتی کا گراف کچھ ایسا ہی ہے۔ ہوا موافق اور منافقانہ سی چل رہی ہو تو پوہ بارہ اور بادِ مخالف میں یہ قدموں میں پڑے دکھائی دیتے ہیں۔

اب آپ تصور کریں اُس باپ کا جس کا بڑا بیٹا مستنصر حسین تارڑ میٹرک سے آگے بڑھ نہیں سکا (یاد رہے یہ پرانے وقتوں اور وَختوں کا میٹرک ہے ورنہ نذیر ناجی جیسے مڈل پاس تارڑ سے بھی کہیں بڑھ کر کمارہے ہیں اور بہتر سماجی مرتبہ اور مقام رکھتے ہیں) آوارہ گرد ہے۔ نوکری کا مزاج نہیں رکھتا۔ بیجوں کی دکان یعنی روزی کے اڈے پر بیٹھ کر سرعام افسانے لکھتا ہے اور دکان کے عقب میں جا کر چھوٹا، بڑا پیشاب کرتا ہے۔ باپ کو کچھ کما کر دینے کی بجائے اُس کی کمائی چائے پلانے میں اُڑا دیتا ہے کیونکہ کوئی بھی راہ گیر یا اُس کا ادیب، شاعر دوست چائے کے بغیر اُس کا افسانہ سننے کا روادار نہیں۔ افسانے بھی پھُسپھُسے "بابا بگلوس" جیسے۔

- کیا چوہدری رحمت خان تارڑ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا رہے گا؟
- کیا منٹو کی وفات کے بعد افسانے کا ٹھنڈا گوشت کفن سمیت اُٹھ کھڑا ہو گا؟
- کیا مستنصر حسین تارڑ مسلسل جھاڑیں کھانے سے بچنے کے لیے دھتورے کے بیج کھا کر سو رہے گا؟

ان سوالوں کے جوابات پر اُردو ادب کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ تارڑ نے جب افسانے کے میدان میں اپنی 10 سالہ نابالغ محنت کی عزت لُٹتے دیکھی تو بیرون ملک راہِ فرار اختیار کی مگر وہ کسی N.R.O کے تحت نہ گئے تھے نہ ہی واپس آئے۔ بیرون ملک جانے کے لیے انہوں نے علی نامی ایک کار ڈیلر کو بہ طور فنانسر پھانسا۔ علی کا تو تادمِ تحریر کوئی سفرنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا البتہ تارڑ کا سفرنامہ "نکلے تری تلاش میں" شائع ہو گیا۔ اس زمانے میں پاکستانی عوام کی بدیسی دنیا کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ وہ تارڑ جیسے جھوٹے نبی پر ایمان لانے پر مجبور تھے کیونکہ اور کوئی آپشن تھی ہی نہیں۔ "نکلے تری تلاش میں" کو چار چاند مسلم دنیا کے عظیم ترین

خطاط اور پینٹر صادقین کے سکیچز نے لگا دیئے (یہ سکیچز سال 2012 میں تارڑ نے گھریلو حالات اور مالی مشکلات سے تنگ آ کر فروخت کر دیئے) پینٹر کی ایک تصویر رائٹر کے لکھے ہوئے سو صفحات پر بھاری ہوتی ہے اور مُصور بھی صادقین جیسا ہو تو سبحان اللہ! اس کتاب کو لاہور کے مشہور کاتب محمد حسین شاہ کے بیٹے خالد سیف اللہ نے اپنے اشاعتی ادارے ''التحریر''، اردو بازار، لاہور سے بڑے اہتمام کے ساتھ پہلی بار شائع کیا۔ اسی ادارے نے پروین شاکر کو بھی اُن کے پہلے شعری مجموعے: ''خوشبو'' کو شائع کر کے متعارف کروایا تھا۔

''نکلے تری تلاش میں'' Hit ہو گئی اور اَدب تارڑ کے لیے ذریعہ روزگار بنا۔ یہاں تک تو معاملہ اَدبی ہی تھا بلکہ آرٹسٹک بھی۔ تارڑ نے اپنے افسانوں کی 12 مصالحوں والی کوزی حلیم سفر نامے کے نام پر اَز سرِ نو پکائی جس طرح لیڈیز ٹیلر کوا کثر نک چڑھی خواتین کے سوٹ دوبارہ بخیے اُدھیڑ کر سینے پڑتے ہیں۔ یہ ویسا ہی انتقام تھا جیسا Pablo Picasso نے اپنی روایتی مصوری مسترد ہو جانے پر تجریدی مصوری کے نام پر لیا تھا۔ پکاسو نے تو یہ کام بڑے دبنگ انداز میں یہ بیان دے کر کیا: ''اب میں ایسی تصویریں بناؤں گا جن کی لوگوں کو سمجھ بھی نہیں آئے گی اور وہ ان کی داد بھی دیں گے'' پکاسو کا جنم اور پرورش سچے معاشرے میں ہوئی تھی۔ وہ ایسی بات کہنے کی جرأت رکھتا تھا۔ تارڑ کے پلے کیا تھا؟ تارڑ، منافق معاشرے کا نمائندہ تھا۔ کام اُس نے بھی پکاسو والا ہی کیا مگر اپنی کلرنگ کا اعتراف کیے بغیر۔ نقل ہر جگہ ایک سا نتیجہ نہیں دیتی۔ پکاسو کی وجہ سے تو مصوری پر اجتہادی دروازے کھل گئے اور بہت سے مصوروں نے راہ پائی مگر تارڑ نے سفر نامے کا ایسا ستیاناس کیا کہ بہت سے لوگ تارڑ سے کہیں بڑھ کر اصلی سفر کرنے کے باوجود سفر نامہ لکھنے سے گریزاں رہے کیونکہ وہ ''تارڑ'' کہلوانا نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی سفر نامہ، نعت کی طرح تنقید سے بالاتر ہے اور تنقید کے دائرے سے خارج چیز اَدب سے بھی باہر ہے۔ افسانے کا میدان چھوڑ کر بھاگنے کی ایک وجہ تارڑ کی وہ حرکت بھی تھی جو انہوں نے فرخندہ لودھی کا افسانہ: ''خاتون دوم'' اپنے نام اور عنوان سے پڑھ کر حلقہ اربابِ ذوق، لاہور میں کی تھی۔

فرخندہ لودھی، صابر لودھی کے ساتھ کی وجہ سے صابر خاتون تھیں ورنہ ادیب برادری اُن کی آواز: ''میں لُٹ گئی، برباد ہو گئی'' پر لبیک کہنے کو تیار تھی اور تارڑ کے پتلے جلانے اور جوتے مارنے کا عمل ایک اشارے کی بات تھی۔

تارڑ کو گوالمنڈی چوک سے اُٹھا کر اُردو بازار بٹھانے اور کمرشل ازم کی راہ پر ڈالنے والی نائیکہ کا نام ہے: سرور سکھیرا۔ سرور سکھیرا کا منفرد طرز اور بمبو سائز کا رسالہ: ''دھنک'' اُن مخصوص ایام میں بہت خونی ہو رہا تھا اور عوام سے خون بہا وصول کر رہا تھا۔ سرور سکھیرا نے تارڑ کو نوٹوں کی جھلک دکھلائی اور آرڈر دیا کہ وہ ''نکلے تری تلاش میں'' کے ایک مشہور باب: ''اپاہج وینس'' کی کچی لسی بنا کر لائے جیسی قرۃ العین حیدر نے ہرمن ہیسے کے ناول: ''سدھارتا'' کی ''آگ کا دریا'' کے نام سے بنائی تھی۔ تارڑ ''پیار کا پہلا شہر'' بنا کر لے آیا۔ یہ وقتی فائدہ تارڑ کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ وہ اُس نعت خواں بچے کی طرح پروفیشنل ہو گیا جس کو اُس کی خوش الحانی کی داد سکوں کی صورت میں ملنے لگے تو وہ دیگیں پکانی چھوڑ کر اویس رضا قادری بن جاتا ہے۔ ''نکلے تری تلاش میں'' دراصل تارڑ کا شہرت کی تلاش کا سفر تھا جس کے دوران تارڑ نے ہر اُس جگہ ہاتھ مارا جس کی اجازت اُسے اُس کی خود ساختہ اخلاقیات دیتی تھی۔

کمرشل تقاضے نباہتا ہوا ''جوکالیاں'' سے نکلا ہوا یہ نالہ، سنگ میل، سرکلر روڈ لاہور (حال:- 25 لوئر مال، لاہور) جیسے

اشاعتی ادارے میں جا گرا جو فلٹر شدہ پانی کو ''منرل واٹر'' کے نام سے مہنگا کر کے بیچنے کا ماہر تھا۔ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ یونانی حسن کاغذوں سے نکل کر PTV پر بھی گیا مگر B&W ہونے کے باعث اپنے حُسن کا کسی کو گرویدہ نہ کر سکا۔

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کِھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

اور جب PTV کو چار رنگ میسر ہوئے تو حضرتِ تارڑ کی جوانی رخصت ہو چکی تھی اور اُس وقت ''چاچا جی'' واحد آپشن تھی جو فرحت عباس شاہ کے ''خبرناک'' والے ''ماسٹر جی'' سے تو ہزار درجے بہتر تھی۔ کریلوں کے بیج گوالا منڈی میں فروخت کرتے کرتے تارڑ کی زندگی میں بھی کریلا پن در آیا۔ وہ بھی ''جنرل ضیاع'' کی طرح اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں ہر بندے میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے تھے۔ بیج افسانہ نویسی کے باعث زیادہ عرصے تک فروخت نہ ہوں تو انہیں کیڑا لگ جاتا ہے اور وہ پانی کے اوپر گندے انڈے کی طرح تیرنے لگتے ہیں مگر پینٹیم ڈیڑھ دماغ کے باعث خوش ہوتے ہیں کہ ہم سب کو نمایاں طور پر تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور صاف کھرا مال پانی کی تہہ میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہ خاصیت بھی انہوں نے اپنی دکان سے ہی پائی تھی۔

تارڑ نے اپنی شہرت کو کیش کروانے کی کوشش ایک بار اپنے گھر کے باہر کوڑے کے ڈھیر لگانے والے کچے پکے سرکاری ملازموں یعنی سینٹری ورکرز پر کی۔ نتیجہ؟ تارڑ کے نام پر پرانا کوڑا تو وہاں سے کیا اُٹھتا وہاں مستقل طور پر لوہے کا بڑا کوڑے دان لا کر رکھ دیا گیا جس پر لکھا تھا: ''کوڑے کو آگ لگانا سخت منع ہے'' مضحکہ خیز صورت حال اُس وقت پیدا ہوئی جب کسی نے ''کوڑے'' کا آدھا ''ک'' اُڑا دیا۔ اُس کے بعد تارڑ نے چشم پوشی اور زبان بندی کے جو عظیم مثال قائم کی وہ باعث عبرت ہے ہر خود پسند کے لیے جو خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ تارڑ نے اپنی خود پسندی کے خول پر ایسا خود چڑھا رکھا ہے جو خود پسندی کو مروت کے ساتھ نکل بھاگنے نہیں دیتا۔ تارڑ جیسے ہی ایک خود پسند کا قصہ ہے کہ وہ شدید مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اُس کے ایک قریبی دوست نے جو اُس کے اچھے دنوں سے واقف تھا اُس پر ترس کھاتے ہوئے اُسے اصلی نوٹ چھاپنے والی مشین، کاغذ، سیاہی اور ڈائیاں دیں تاکہ وہ نوٹ چھاپ کر خود کو سیٹ کر لے اور خود ملک سے باہر چلا گیا۔ ایک روز وہ اخبار میں پاکستان کی خبریں پڑھ رہا تھا تو اُس کی نظر ایک خبر پر پڑی جو اُس کے دوست کے حوالے سے تھی جو جعلی کرنسی کیس میں پکڑا گیا تھا۔ دوست نے سر پکڑ لیا کہ صدفی صد اصلی مشینری اور کاغذ کے باوجود اُس کا دوست آخر پکڑا کیسے گیا؟ جب وہ پاکستان آیا تو اُس نے جیل میں دوست سے ملاقات کی اور پوچھا: ''یہ سب کیا ہے؟ اور کیسے ہوا؟ سلاخوں کے پیچھے قید دوست نے سر جھکائے شرمندگی سے جواب دیا: ''بس خود پسندی کے ہاتھوں مارا گیا۔ قائداعظم کی جگہ اپنی تصویر پرنٹ کر دی تھی نوٹوں پر'' یہی حرکت تارڑ نے بھی کی ''بہاؤ'' ناول پر اپنا نام دے کر۔ ''بہاؤ'' کی ساری تحقیق ملتان کے ابن حنیف صاحب کی تھی۔ ناول پر اس بات کا ذکر نہ کر کے تارڑ نے اپنے اصلی نوٹ کو جعلی نوٹ بنا لیا۔

تارڑ کی خود پسندی کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر جیسا جھٹکا اُس وقت لگا جب اُن کی بیٹی عینی (جو کنیئرڈ کالج، لاہور کی طالبہ تھی) نے آکر انہیں بتایا کہ موٹر سائیکل سوار لڑکے اُس کو چھیڑتے اور تنگ کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے خود پسندی کی تاڑی پیتے ہوئے، بڑے دبنگ انداز میں غلام حسین ساجد کی طرح حلق سے آواز نکالتے ہوئے عینی بیٹی سے خطاب کیا: ''پھر کبھی دوبارہ نظر آئیں تو کہنا میں

مستنصر حسین تارڑ کی بیٹی ہوں'' عینی کا جواب تارڑ کا دل ہلا دینے والا تھا: ''اسی وجہ سے تو تنگ کرتے ہیں'' اُن کے اندر موجود ''تارڑیت'' کا جنازہ تو کئی بار نکل چکا ہے مگر یہ جنازگاہ سدا آباد رہتی ہے۔

اشفاق احمد کے نام سے تو لاہور میں ''انڈر پاس'' بن گیا مگر تارڑ کے نام کی ایک گلی تک نہیں بنی۔ تارڑ نے اداکارہ فردوس کے گھر جا کر کئی بار نک گھسنی کی کہ وہ ''فردوس مارکیٹ'' کا نام ''تارڑ مارکیٹ'' رکھ دے مگر فردوس کا ''ہیر رانجھا'' والا نشہ اُترے تو وہ ایسی باتوں پر غور کرے۔ اپنی اس محرومی کا ازالہ تارڑ اپنی تحریروں میں یوں کرتے ہیں کہ K-2 کے پاس اتفاقیہ طور پر ایک جھیل وجود پا گئی جس کا نام وہاں کے لوگوں نے ''تارڑ جھیل'' رکھ دیا۔ ماڈل ٹاؤن پارک میں تارڑ اکثر و بیشتر کیٹ واک کرنے جاتے ہیں۔ وہاں اُس جگہ کا نام ''تارڑ کارنر'' رکھ دیا گیا جہاں یہ تھکن سے نڈھال ہو کر گر جاتے ہیں اور گھر واپسی سٹریچر پر قاضی جاوید اور شاہد علی خاں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

ہر بچے کو بچپن ہی سے ''بڑا'' بننے کا شوق ہوتا ہے، تارڑ کو بھی تھا مگر نہ تو اُن کے والد علامہ اقبال تھے نہ ہی وہ خود جاوید اقبال تھے جو انہیں گورنمنٹ کالج، لاہور (موجودہ G.C یونیورسٹی) میں داخلہ مل جاتا۔ اُن کا داخلہ گورنمنٹ کالج میں کچھ اس طرح ہوا کہ وہ مسلم ماڈل ہائی سکول کی دیوار ٹاپ کر پتنگ لوٹنے کی خاطر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے اور پتنگ لوٹ کر ہنستے کھیلتے مین گیٹ سے باہر نکل گئے۔ بقلم خود یہ مشہور کر دیا کہ وہ Ravian ہیں جبکہ وہ Jokalian تھے۔ میں نے تارڑ کے اس دعوے کی تصدیق کی غرض سے گورنمنٹ کالج، لاہور (GCU) کے چپے چپے کو چھان مارا۔ وہاں کالج کے لیے باعث عزت بننے والے مشہور طالب علموں (بالخصوص رائٹرز) کے نام کی خوبصورت تختیاں جابجا لگی تھیں۔ کس کس کا نام لوں: فیض احمد فیضؔ، صوفی غلام مصطفی تبسمؔ، سوندھی، مظفر علی سیّد، پطرس بخاری اور کنہیا لعل کپور جیسے کئی بڑے نام۔ تارڑ کے نام کی تختی تلاش کرتے کرتے میں واش روم تک گیا مگر اُن کے نام نامی کی تختی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ تارڑ شہنشاہ وقت تو تھے نہیں کہ جھوٹی تاریخ لکھ کر یا لکھوا کر تاریخ میں امر ہو جاتے۔ اُن کی اس دروغ بیانی کا بھانڈا فرخندہ لودھی کے شوہر نامدار صابر لودھی نے بیچ اُردو بازار ایسا پھوڑا کہ وہ تارڑ کے لیے پھوڑا بن گیا۔ ہر انسان اپنے بڑوں سے چھوٹا بن کر کچھ لیتا ہے اور بڑا بن کر کچھ دیتا ہے مگر تارڑ نے نہ بڑوں کو معاف کیا نہ ہی چھوٹوں کو بخشا۔ ملتان کے ابن حنیف اُن سے بڑے تھے ہر لحاظ سے۔ تارڑ نے اپنے ناول ''بہاؤ'' کی ساری ریسرچ اُن سے کئی سال تک مفت میں کروائی اور ناول پر صرف اپنا نام دیا۔ یہ تو تھا اپنے سے بڑے کے ساتھ حُسنِ سلوک۔ چوٹی زیریں، ڈیرہ غازی خان کا ڈاکٹر عباس برمانی اُن سے چھوٹا تھا۔ تارڑ نے اُس بیچارے کا بھی رگڑا نکال دیا۔ تارڑ نے ڈاکٹر عباس برمانی کے خرچے اور اپنے نخرے پر، کشتی میں دریائے سندھ کا سفر کیا۔ ڈاکٹر عباس برمانی کا سفرنامہ ''میرا سندھو سائیں'' سنگ میل سے طبع ہوا۔ برمانی بیچارہ غلطی یہ کر بیٹھا کہ اپنی کتاب کا مسودہ فلیپ لکھنے کے لیے تارڑ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ تارڑ نے جب تک اپنے ناول ''قربت مرگ میں محبت'' کا مواد ''میرا سندھو سائیں'' میں سے نکال نہیں لیا برمانی کو فلیپ لکھ کر نہیں دیا۔ ''قربت مرگ میں محبت'' بھی سنگ میل سے ''میرا سندھو سائیں'' سے کچھ عرصے بعد طبع ہو گیا۔

ریڈر پریشان ہو گیا کہ میں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں؟ یا تو ''میرا سندھو سائیں'' کے ساتھ ''قربت مرگ میں محبت'' کا معاملہ پیزا جیسا ایک کے ساتھ ایک فری والا ہوتا تو بات بن جاتی اور دب بھی جاتی۔ مگر ریڈر کے ساتھ تو ہاتھ ہوا تھا۔ انہوں نے تارڑ کی

رہائش گاہ ل-22 گلبرگ ،لاہور کا گھیراؤ کرلیا۔ بھاگنے میں تو تارڑ کا کوئی ثانی نہیں پہلا سانس نیو یارک پہنچ کرلیا۔عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفارتی اثر ورسوخ سے کام لے کر گھیراؤ ختم کروایا اور معاملے پر چکنی مٹی ڈالی۔غلام حسین ساجد نے D چوک اسلام آباد کی طرح تارڑ کے گھر کے سامنے دھرنے کے دوران پھیل جانے والی گندگی کی صفائی آزاد مہدی اور عظیم اقبال سے مل کر کی اور تارڑ کو اس صفائی کی DVD نیو یارک بھجوائی۔تاریخ میں تو نام تارڑ کا ہی زندہ رہے گا اِن خاموش محسنوں کا نہیں جنہوں نے تارڑ کے نام پر حرف نہ آنے دیا۔

جہاں تارڑ کا ''پنڈ روہ ٹچ'' پسند کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں وہیں PTV پروڈیوسر یعقوب ناسک جیسے باشعور قارئین بھی ہیں جو تارڑ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں: ''میں یورپی ممالک کے سیاحتی سفر پر تھا۔ٹرین میں میرے ساتھ ایک حسین و جمیل کنواری دوشیزہ آ بیٹھی۔ٹرین کے ہلکوروں کی وجہ سے اُسے نیند آنے لگی اور وہ میرے شانے پر سر رکھ کر اُونگھنے لگی۔ایک دو بار میں نے نظر انداز کیا لیکن پھر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا: ''بی بی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرا نام مستنصر حسین تارڑ نہیں''

تارڑ کو اپنی ذہانت نما کمینگی کی داد پانے کا بھی بڑا شوق ہے۔انہوں نے پورے لاہور میں مشہور کیا کہ انہوں نے PTV اسلام آباد سے صبح کی ''چاچا جی'' والی نشریات اُس پروگرام کے پروڈیوسر زیدی صاحب کو لاہور میں مرغ چھولے کی ایک پلیٹ کھلا کر حاصل کی تھی۔ اگر اسے لاہوری مرغ چھولے کی پلیٹ کا کرشمہ سمجھ لیا جائے تو لاہور فلم انڈسٹری کا گڑھ تھا اور وہ یونانی حُسن کے مالک بھی تھے۔اُن کے لیے تو بڑا آسان تھا کہ اپنے حُسن کا جلوہ دکھا کر کسی پروڈیوسر یا فلم ڈائریکٹر کو شراب کی بوتل (جو وہ خود اکیلے پیتے ہیں) پلا کر کسی فلم میں کام پکڑ لیتے۔ PTV بلیک اینڈ وائٹ تھا۔پاکستانی فلمیں تو اس وقت رنگین بن رہی تھیں ناں۔ پاکستانی فلم انڈسٹری جو یونانی حسن کو ترسی ہوئی تھی یونانی حُسن کے مجسمے کو ہاتھوں ہاتھ لیتی۔اس سلسلے میں فلمی صحافی طفیل اختر سے بات ہوئی تو انہوں نے راقم کی طبیعت صاف کرتے ہوئے کہا: ''عرفان صاحب فلم ایکسپریشن کا میڈیم ہے۔تارڑ کے چہرے پر تو غلام اسحاق خان کی طرح ایکسپریشن نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔فلم انڈسٹری اس کاٹھ کے اُلو کا کیا کرتی؟ فلم انڈسٹری کا جوزوال سلطان راہی اور نور جہاں کے جانے سے ہوا مستنصر حسین تارڑ کے فلم انڈسٹری میں درآنے کی صورت میں 70 کی دہائی ہی میں ہو جاتا اور تارڑ تا حال مفرور ہوتا''

اس خاکے کے توسط سے قارئین کو پہلی بار یہ بھی پتا چلے گا کہ مستنصر حسین تارڑ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔نمونۂ کلام حاضر ہے:

ساحل کی ریت
مجھے میرا نام نہیں لکھنے دیتی
کیونکہ میرا نام مستنصر حسین تارڑ ہے
اور سمندر میرے باپ کا نہیں

آپ پر لازم ہے کہ اس کلام کے احترام میں باادب کھڑے ہو جائیں۔قبلہ رُو ہو کر کم از کم 3 بار ''واہ، واہ، واہ'' کہیں اور پھر Disprine کھا کر لمبی تان کر سو جائیں۔

ہر انسان خوبیوں، خامیوں، خیر و شر کا مجموعہ ہوتا ہے۔تارڑ کی سب سے بڑی خوبی اُن کی وفاداری ہے اپنے اشاعتی ادارے سنگ

میل سے ورنہ جب سنگ میل کی عقب زنی طاہر اسلم گورا نے اپنے اشاعتی ادارے ''گورا پبلشرز'' سے کی تو سوائے تارڑ کے سنگ میل کے قریب قریب سبھی بڑے نام پیسے اور لنچ کے لالچ میں گورے کی طرف گورے کی طرح ہجرت کر گئے۔ عطاء الحق قاسمی مونہہ متھے کے حساب سے اس مہاجر ٹرین کا انجن تھے اور فرحت عباس شاہ، ڈاکٹر ابرار احمد اور حسن رضوی اس کی بوگیاں تھیں۔ گورا پبلشرز جب ''گورا قبرستان'' بنا تو بہت سے ادیب وشاعر رُل گئے۔ اور تو اور مشہور شاعر ظفر اقبال والد محترم آفتاب اقبال (خبرناک فیم) بھی گورا سے ''ہے ہنومان'' المعروف ''بندرنامہ'' شائع کروا کر ذلیل وخوار ہوجانے والوں میں شامل تھے۔ طاہر اسلم گورا نے مستنصر حسین تارڑ کو بھی فارورڈ بلاک کی قیادت کرنے کے لیے Blank Cheque پیش کیا تھا مگر تارڑ نے یہ پیشکش ٹھکرادی اور اپنا نام تاریخ میں بھٹو کی طرح زندہ رکھا ورنہ وہ بھی آج ''متاثرین گورا'' کے طویل جلوس میں ننگے سر اور ننگے پیر شامل ہوتے۔ تارڑ کو یہ حقیقت بھی معلوم ہونی چاہیے کہ گورا پبلشرز کا ڈاؤن فال سنگ میل نے ہی کروایا تھا اپنے جاسوس، عباس نجمی مرحوم اور اُن کے بھائی ندیم کو بیچ میں ڈال کر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تارڑ کو سنگ میل میں بیٹھے بیٹھے محض سونگھ کر ہی پتہ چل گیا ہو کہ گورا پبلشرز کے Titanic کو ڈبونے کے لیے گلیشیر جلد سامنے آنے والے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہوا تارڑ کے سینے پر سنگ میل سے وفاداری کا تمغہ بدستور جگمگا رہا ہے اور فلور کراسنگ کرنے والے شاعر اور ادیب اشاعتی صحرا میں ہنوز بھٹک رہے ہیں۔

تارڑ نے اپنے بڑے بیٹے اور ولی عہد کا ایک بارعب، دبنگ اور جبرون قسم کا نام رکھنے کے چکر میں ''سلجوق'' رکھا۔ یہ نام میٹرک تک تو اپنی رنگ پوری کر گیا مگر F.C کالج میں جا کر یہ نام ''مجلوق'' کے نام سے شہرت پا گیا۔ صدر شعبہ اُردو احمد عقیل روبی کی شرارتی طالب علموں کو ان نرم الفاظ میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کچھ کام نہ آسکی: ''یہ اپنے تارڑ کا بیٹا ہے اسے نہ ستایا کرو'' انگلش کے پروفیسر محمود علی بتاتے ہیں کہ اس ڈانٹ ڈپٹ کا اُلٹا اثر ہوا اور تنگ کرنے نیز ستانے کی شرح مزید بڑھ گئی۔ ویسے بھی شرارتی طالب علم پیدا کرنے میں F.C کالج کا ریکارڈ ہمیشہ شاندار رہا۔ جنرل مشرف جیسا شرارتی جنرل F.C کالج ہی کی پیداوار تھا، کسی دار کالج کی نہیں۔ جیسی جیسی شرارتیں انہوں نے منگلا چھاؤنی اور بعد ازاں نواز شریف اور اُن کے خاندان کے ساتھ کیں وہ آج بھی خادم الحرمین شریفین کو مونہہ زبانی یاد ہیں۔ تارڑ کو اُڑتی چڑیا کے پر گننے پر تو کمال زندگی کے کسی بھی دور میں حاصل نہیں رہا مگر وہ نہاتی بڑھیا کے ''چینگ'' ضرور گن لیتے ہیں کن اکھیوں سے۔ اشفاق کے گھر میں ریکارڈ کیے گئے PTV کے پرانے میوزیکل پروگراموں میں اُن کی ٹھرکیانہ حرکات بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔

جس طرح تارڑ کو اکثر وبیشتر اپنے نام کا حوالہ دینے پر مونہہ کی کھانی پڑتی ہے ایسا ہی معاملہ شہنشاہِ غزل مہدی حسن کے ساتھ کراچی حیدرآباد سپر ہائی وے پر پیش آیا۔ ڈاکوؤں نے مہدی حسن کی کار روک لی۔ کار سمیت سب کچھ لوٹ کر ہتھل کر دیا۔ مہدی حسن کو گاڑی کی ڈکی میں سے مشروبِ مغرب کی بوتلیں تک اُٹھانے کی رعایت نہ دی۔ مہدی حسن نے ڈاکوؤں کے دل میں رحم ڈالنے کی غرض سے آخری امید کے طور پر اپنا تعارف کروایا: ''میں پاکستان کا مشہور گلوکار مہدی حسن ہوں۔ بقول لتا میرے گلے میں بھگوان بولتے ہیں'' ڈاکوؤں پر اس تعارف کا اُلٹا اثر ہوا: ''اڑے تمہارے گلے میں بھگوان بولتے ہیں تو اَماڑے گلے میں الطاف بھائی بولتے ہیں'' انہوں نے شہنشاہِ غزل جیسے سپر سٹار کو سپر ہائی وے پر مرغا بنا دیا۔ اس معاملے میں کھیلوں کی دنیا میں پاکستان کی سب سے

قابل فخر شخصیت جہانگیر خان نے عقل مندی اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ انہیں لندن میں گورے ڈاکوؤں نے روکا اور لوٹا تو انہوں نے نہ تو اپنا کوئی تعارف کروایا نہ ہی ویسی مزاحمت کی جیسی وہ اسکوائش کورٹ میں کرتے تھے۔ ڈاکوؤں کو جیب میں موجود سب کچھ دے کر آ گئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، تارڑ کے بارے میں اپنے ہر ملاقاتی، بالخصوص مضافاتی کو ایک دلچسپ واقعہ اکثر سناتے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مارگریٹ تھیچر کی آٹو بائیوگرافی مارکیٹ میں نئی نئی آئی تھی۔ تارڑ نے کہیں ٹی وی پر مارگریٹ تھیچر کو آٹوگراف کے ساتھ کتاب کی سینکڑوں کاپیاں دیتے دیکھ لیا۔ سنگ میل آ کر نیاز احمد سے اس بات کا ذکر کیا کہ پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہم بیک ورڈ کیوں ہیں؟ نیاز احمد نے تارڑ کی بات سے صدفی صد اتفاق کیا اور ایک دن سنگ میل کے شوروم کے باہر اس مضمون کا بینر لہرا تھا: ''آج پاکستان کے مشہور سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ اپنی کتاب پرستاروں کو آٹوگراف کے ساتھ دیں گے'' ڈاکٹر سلیم اختر بتاتے ہیں کہ میں، نیاز احمد، تارڑ اور انتظار حسین سنگ میل کے دفتر میں بیٹھے تارڑ کے پرستاروں کا انتظار صبح 10 سے دن ایک بجے تک کرتے رہے۔ وہ دن تارڑ کا دن نہیں تھا۔ ایک بھی پرستار اُس دن سنگ میل کے شوروم پر نہ پھٹکا۔ اس سے پہلے کہ پوری کا بینہ بدمزہ ہوتی، تارڑ خود یہ کہتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے: ''یہ قوم اس قابل ہی نہیں کہ اسے مجھ جیسا رائٹر اپنی کتاب آٹوگراف کر کے دے''

جس طرح عرب قوم نے اپنے اندر کا بدّو مرنے نہیں دیا، اسی طرح تارڑ نے بھی اپنے اندر کے پینڈو کو ڈھُڈے مار مار کر زندہ رکھا ہوا ہے۔ ایاز نے اپنے پرانے کپڑے ایک صندوق میں سنبھال رکھے تھے، غربت اور غلامی کے دور کی یاد تازہ رکھنے کے لیے۔ تارڑ نے سلور کی وہ ''کلفی'' سنبھال رکھی ہے جس میں وہ اپنا لنچ سکول لے کر جاتے تھے۔ اُن کا لنچ دیسی گھی کا پراٹھا تھا جو انہیں بہت پسند تھا۔ اسی وجہ سے سکول میں اُن کی چھیڑ ''پرونٹھا'' تھی۔ تارڑ اس بات پر واقعی فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے دیسی خوراک کھائی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور دنیا بھر میں ہواخوری کی ہے۔ اسی وجہ سے عمر کی 75 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ برگر، شوارمے اور Pepsi کے زور پر تو اب آپ 50 تک بھی چلے جائیں تو بڑی بات ہے کیونکہ آج کل مکمل صحت مند انسان کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے کسی بیمار کو نہیں۔ ویسے تو تارڑ کے سامنے بانوے سالہ انتظار حسین اور اٹھاسی سالہ مسعود اشعر جیسی قابل رشک صحت کی زندہ مثالیں موجود ہیں مگر اُن میں یونانیت مفقود ہے اُن پر ہندوی اثرات بہت نمایاں ہیں صرف قشقہ کھینچنے کی کسر ہے۔

تارڑ کے فن پر بات کرنے کے لیے ہم نمکین نثری دیگ کا ایک چاول، ناول ''راکھ'' چکھتے ہیں اور دیگ کے سفرناموں والی کھُرچن رہنے دیتے ہیں۔ دیگ اگر شاعری یعنی میٹھے کی ہوتو اُس کی ''گھروڑی'' بھی مزے میں لاجواب ہوتی ہے۔ ''راکھ'' میں ریڈر کو تارڑ نے جتنا احمق سمجھا ہے اتنا تو کسی فوجی ڈکٹیٹر نے عوام کو بھی نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ لاہور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دریائے راوی کہیں پایاب ہے اور کہیں سینکڑوں میٹر گہرا ہوجاتا ہے'' دریائے راوی کس مقام پر سینکڑوں میٹر گہرا ہے؟ وہ شرم کا مقام ہی ہوگا جس کی نشاندہی تارڑ جیسا پٹواری ہی کرسکتا ہے۔ ''آج پھر سبزی والا سبزی کے ساتھ مفت میں ہرادھنیا اور ادرک نہیں دے کر گیا تھا'' یہ اصل میں قوم کو مفت میں ملنے والا ہرادھنیا بند کروانے کی سازش تھی جو تارڑ نے ادرک کی آڑ میں کی۔ لاہور کے اصل بائیوگرافر تو طارق اسمٰعیل ساگر ہیں جو اپنی آٹو بائیوگرافی: ''مجھے کھا گئے'' میں تارڑ سے بڑھ کر مفت سبزی کی بات ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''سبزی کے ساتھ مولیاں، پھونکاں والا پیاز، سبز مرچ، ہرادھنیا، پودینہ مفت ملا کرتے تھے'' اس لسٹ میں اگر ''ادرک'' بھی

شامل ہوتاتو ساگر، تارڑ پر نمبر لے جاتے مگر ساگر، سچ اور جھوٹ کا فرق سمجھتے ہیں۔ ادرک کو Free List میں ڈالنے سے بڑی اور کیا سازش ہوسکتی ہے قوم کے ساتھ۔ تارڑ نے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلانے والی مثال اپنے ناول میں ایسے قائم کی کہ ایک کمرے میں کتے اور بلیاں اکٹھے کردیئے جن میں ایک حاملہ بلی بھی تھی۔ اتنی زیادہ لاعلمی ایک سفرنامہ نگار تو افورڈ کرسکتا ہے، ناول نگار نہیں۔ تارڑ دوسروں کے پلے سے کھانا حلال اور اپنے پلے سے کھانا حرام سمجھتے ہیں۔ یہی معاملہ اُن کی سالگرہ کے ساتھ ہے جو اکثر سالن گرہ بن جاتی ہے۔ تارڑ کی ایک سالگرہ پر راقم کو یہ اچھوتا خیال آیا کہ یہ سالگرہ سنگ میل کے شوروم پر ہونی چاہیے جن کو تارڑ نے کروڑ پتی بنادیا۔ مارچ کی کیم تاریخ ہوتو آدمی کا دل خواہ مخواہ آوٹنگ کو چاہتا ہے۔ تارڑ کی سالگرہ کا SMS جو میرے موبائل سے On Air ہوا تھا اُن کی موت کی خبر کی طرح شہر بھر کے ادیبوں میں پھیل گیا۔ سالگرہ کا کیک شام 7 بجے سنگ میل کے شوروم پر کٹنا تھا جس کے بعد شاندار ڈنر کا بھی اہتمام تھا۔

SMS کی ٹائمنگ بڑی شاندار تھی۔ امجد طفیل جن کے بغیر لاہور کی کوئی اَدبی تقریب مکمل نہیں ہوتی اس سالگرہ کو بھی فائنل ٹچ دینے اپنے سینے اور کمر کے درمیان واٹر کولر باندھے وہاں پہنچ گئے۔ افتخار مجاز، اعجاز احمد فکرال، شیما مجید اور کئی دوسرے 'ویہلے' بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں کسی سالگرہ کے دور دور تک آثار نہ پاتے ہوئے، ان خواتین وحضرات نے مشترکہ صدا لگائی: ''تارڑ کے نام پر کچھ دو نیاز بابا'' سنگ میل والوں نے اس مبارک دن جس سنگ دلی، کاروباری ذہنیت اور سفاکی کا مظاہرہ کیا اُس نے مظاہرین کی چیخیں نکلوادیں۔ سنگ میل والے وقت سے پہلے ہی اپنا شوروم بند کرکے بھاگ گئے کیونکہ مزید ادیب ابھی آرہے تھے۔ مُحبانِ تارڑ کا یہ اجتماع سنگ میل کے ساتھ واقع ''شیزان بیکری'' سے حسب توفیق اپنے پلے سے کھا کر پُرامن طور پر منتشر اور رخصت ہوا البتہ اعجاز احمد فکرال جیسے جذباتی اور جوشیلے نے سنگ میل کے بند شٹر کو ٹھڈے مارے۔

کچھ شاعر اور ادیب اَدبی تقریبات کو رونق بخشنے کے لیے ''ذوالجناح'' کی طرح لائے جاتے ہیں مگر کچھ بدقسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو ''آ تارڑ مجھے مار'' والا کام کر بیٹھتے ہیں۔ ایک دردناک مثال سادہ لوح ڈاکٹر وحید احمد ہیں جو تارڑ کو T.A/D.A کے ساتھ فیصل آباد میں اپنے ناول: ''زینو'' کے فنکشن میں بلانے کی غلطی کر بیٹھے اور تارڑ شراب کے راشن پر پلے ہوئے ہسپانوی بیل کی طرح تقریب میں صاحب کتاب کو ہی اپنے اَدبی سینگوں پر اُٹھا اُٹھا کر پٹخنے لگے اور پیچھے سے دُم بھی کھڑی کرلی۔ تقریب میں ''گو تارڑ گو'' کے نعرے انجم سلیمی گروپ نے اس وقت لگائے جب تارڑ نے یہ تیزابی جملے کہے: ''ڈاکٹر وحید احمد نے ناول: ''زینو'' دو سال کی مدت میں لکھا ہے اس ناول کی عمر 2 سال ہی ہوگی'' تارڑ بھی بندہ دیکھ کر ہی سینگ مارتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید احمد کلین شیو، شریف النفس، ٹھنڈے ٹھار شہتوت جلیبی قسم کے انسان ہیں۔ اُن کی جگہ کرنل محمد خان بیٹھے ہوتے یا بریگیڈیر شفیق الرحمن کی کتاب ہوتی تو تارڑ سیلوٹ مار کر اپنی تقریر شروع کرتے اور ڈنڈوٹ کرتے کرتے اُن کی واپسی ہوتی۔ تارڑ کو ناول: ''زینو'' پر اصل مروڑ اس وجہ سے اُٹھا تھا کہ وہ یونانی پس منظر میں تھا اور وہ ''یونانی، یونانی'' سے ہونے کے باوجود یونان پر کچھ نہیں لکھ سکے تھے اور ڈاکٹر وحید احمد یونان کے حوالے سے اُن پر بازی لے گئے تھے۔ ڈاکٹر وحید احمد کی سادگی کو ظاہر کرنے کے لیے اتنا بتادینا ہی کافی ہے کہ ایک بار 14 اگست کو سرکاری اعزازات کا اعلان ہوا اُن میں ایک نام ''وحید احمد'' بھی تھا جو کوئی اور صاحب تھے۔ ڈاکٹر وحید احمد نے اُسے اپنا نام تصور کرتے ہوئے

کئی دوستوں کومٹھائی بھی کھلا دی اورفون بھی کھڑکا دیئے۔پھر کہیں جا کرانہیں پتہ چلا کہ نام کی مماثلت نے یہ گل کھلا یا ہے۔

اچھی تخلیق کسی کی میراث نہیں ہوتی،عطیۂ خداوندی ہوتی ہے۔خدا کسی کوبھی کسی وقت نوازسکتا ہے۔مثال کے طور پرشہزادنیئرؔ نے سیاچن کے حوالے سے جوطویل نظم لکھی ہے وہ تجربے کی سطح پر(تخلیقی سطح پرنہیں)مرزاغالبؔ کے حصے میں بھی نہ آسکی۔مرزاغالب تو دِلّی سے کلکتے تک گرتے پڑتے ہوئے گئے تھےاورمرتے مرتے لوٹے تھے جبکہ میجر شہزادنیئرؔ ایک فوجی ہونے کے ناطے اپنی جان کا100% رسک لے کرسیاچن گیا تھااور وہ منفرداورانوکھا تجربہ لے کرلوٹا تھا جس کا مرزاغالبؔ تصور بھی باندھتے تو ڈبل نمونیئے سے کم پر بریک نہ لگاتے۔ادب کوئی فلمی دنیانہیں جہاں ''نمبرون'' کی کوئی دوڑلگی ہے۔ادب ساگر میں شعرونثر کے ندی نالے گرتے ہی رہتے ہیں۔کسی کا حصہ کم کسی کا زیادہ ہے۔بس اتنی سی بات ہے۔شعروشاعری میں تو اُستادی،شاگردی چلتی رہی ہے۔کئی مثالیں موجود ہیں مگر نثر میں اُستاد،شاگردوالا معاملہ کم ہی دیکھنے کوملتا ہے۔تارڑ خودبھی ''بے استادے'' تھے نہ ہی خودکوئی شاگردتیارکیا اُلٹا تارڑیت کا مظاہرہ یہ کیا کہ اپنے CSP بیٹے سمیر تارڑ سے اپنی کتابوں کے ٹائٹل بھی بنوائے،سنگ میل سے اُن کے پیسے بھی کھرے کیے اوراس سے بھی دوقدم آگے بڑھ کرسمیر تارڑ''مستنصر حسین تارڑ'' کے قلمی نام سے روزنامہ''ڈان''میں انگلش کالم بھی لکھتا ہے۔یہ اعزازعطاء الحق قاسمی کے بیٹے یاسرپیرزادہ کوہی حاصل ہے کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی سرکاری رہائش گاہ میں بیٹھ کر،ذراہٹ کےفرینڈلی اپوزیشن کا کردار پوری مہارت کے ساتھ ادا کرتا ہے اور دفتر میں آنے والے کسی بھی سائل کی جیب خالی کر کے بھیجتا ہے۔باپ،دادا کا ذریعہ آمدن''چندہ''تھا اگر تیسری نسل کا ذریعہ معاش یہ کچھ ہو گیا تو کون سی قیامت آ گئی۔PTV پرکسی زمانے میں عمران پیرزادہ کا ایک Puppet Show چلتا تھا،جس میں ایک مگرمچھنی،مگرمچھ کوMr. Hand Some کہہ کر پکارتی ہےاور چلی جاتی ہے۔مسٹر ہینڈسم یعنی مگرمچھ کومگرمچھنی کا ہینڈسم کہہ کر بلانا اس قدر لُبھا تا ہے کہ وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو جا تا ہے اور آئینے سے کہتا ہے: ''بول آئینے بول مجھے بتا۔نیز سمجھا،کیا میں واقعی خوبصورت ہوں؟'' مگرمچھ،عمران پیرزادہ کی آواز میں یہ سوال آئینے سے بار بار کرتا ہے۔آئینہ مگرمچھ کو جواب ٹوٹ جانے کی صورت میں دیتا ہے۔تارڑ کوبھی آئینہ یہی جواب بار ہا دے چکا ہے لیکن تارڑ کا سوال بدستور جاری ہے،آئینے بدل بدل کر بجائے اپنی کاسمیٹک سرجری کروانے کے۔

اپنی متروک افسانہ نگاری کا حوالہ اورواسطہ دے کر باجرہ مسرور کی سفارش پراُن کے سرتاج احمد علی خاں،ایڈیٹر''ڈان'' سے ملاقات کرنے کا وقت آج سے 2 عشرے قبل تارڑ نے لیا۔Daily Dawn کے دفتر میں احمد علی خاں صاحب نے تارڑ کا ٹیلنٹ چیک کرنے کی غرض سے اُن کو چنداُردو جملے لکھ کر دیئے کہ وہ اُن کا انگلش میں ترجمہ کر کے دکھائیں۔تارڑ نے زبانی کلامی اپنے ٹیلنٹ سے احمد علی خاں کو قائل کرنا چاہا مگر احمد علی خاں بااصول اور جینوئین آدمی تھے۔تارڑ کو یہ چند آسان اور پولے پولے جملے ترجمہ کرنے کے لیے دیئے گئے:

۱۔ وہ میری نواسی ہے

۲۔ میں ایک عام آدمی ہوں

۳۔ مجھے انگلش آتی ہے

۴۔ میرا مذاق مت اُڑاؤ

۵۔ کراچی کی سڑکوں پر گولیاں چل رہی ہیں

مرتا کیا نہ کرتا۔ تارڑ نے ترجمہ کیا۔ تارڑ کا ترجمہ دیکھ اور پڑھ کر احمد علی خان سناٹے میں آ گئے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

1. She is my eighty nine.
2. I am a mango man.
3. English comes to me.
4. Dont fly my joke.
5. Tablets are walking on the roads of Karachi.

اس کے بعد کیا ہوا ہوگا؟ یہ بتانے کی نہیں سوچنے، سمجھنے کی چیز ہے۔ ان جملوں کا درست ترجمہ غلام حسین غازی کی تربیت کے باعث نور پور سکول، شیخوپورہ کا ہر طالب علم تو کر سکتا ہے مگر تارڑ نہیں۔

اگر Daily Dawn میں شائع ہونے والے انگلش کالموں کو واقعی تارڑ ہی کا مان لیا جائے تو پھر ہم اُن سے انگلش میں ناول لکھنے کی فرمائش کرنے میں حق بجانب سمجھے جائیں گے ورنہ اُن سے درخواست کریں گے کہ وہ انگلش کالموں کا ذکر ناجائز بچے کی طرح نہ چھپایا کریں۔ نام کو Cash کروانے کے چکر میں نام ڈوب بھی جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہاتھی جیسا نام مرنے اور گرنے میں بھی خاصا وقت لیتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ مستنصر حسین تارڑ جیسے کینہ پرور ہاتھی کے ساتھ بھی ہے!

نام میں کیا رکھا ہے

انتہائی خوش لباس، پاکستانی حُسن کی مونہہ بولتی تصویر، دِل موہ لینے والا، لنگڑوں کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر سڑک پار کروانے والا، انتہائی صلح جو نیز امن پسند، ایدھی کی طرح آدھی روٹی کھانے والا، عمران خان جیسا مردانہ وجاحت کا نمونہ، قائداعظم کی طرح بااصول اور، اور، اور

اُف! ضرورت رشتہ کے اشتہار والی تمام خوبیاں اپنے سیلف پورٹریٹ کے آغاز میں جانے کیسے لکھ گیا۔ قسم لے لیں اگر ان میں سے ایک خوبی بھی حضرت عرفان احمد خان میں پائی جاتی ہو۔ ویسے بھی اینٹی ہیرو کا دور چل رہا ہے اتنی خوبیوں کا مالک تو منٹ سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو جائے گا جبکہ مجھے ابھی زندہ رہنا ہے دشمنوں کے سینے پر مونگ (یا جو بھی دال مل جائے) دلنے کے لیے۔ اپنے بارے میں "میں، میں میں" کرتے ہوئے لکھنا مستنصر حسین تارڑ کے لیے آسان ہوگا میرے لیے ہرگز نہیں۔ میرے گنے چُنے دوست اور سہیلیاں ہیں اس لیے اپنا سراپا بیان کرنے کے چکر میں نہیں پڑوں گا ویسے بھی FACEBOOK کے آجانے کے بعد ایسا کرنا غیر ضروری سا محسوس ہونے لگا ہے۔

میرا خاندانی بیک گراؤنڈ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماں، باپ تقسیم کے مارے ہوئے تھے۔ کرایے کے مکان کو جائیداد نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں اپنا 5 مرلے کا ذاتی مکان 1969 میں نصیب ہوا جب انسان چاند پر پہنچا تھا اور ہم سمن آباد پہنچے تھے۔ گھر میں سب سے بڑا اور شرارتی تھا۔ کھیل کود کے مواقع بھی اُس زمانے میں باافراط میسر تھے۔ ہمارے گھر کے اردگرد خالی جگہ اور کھیت ہی کھیت تھے۔ ملتان روڈ ہمارے گھر سے صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہاں سے بیل گاڑیاں موسمی سبزیاں لے کر سبزی منڈی کو جاتی تھیں۔ کچھ مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ بھی لگ جاتا۔ کسی چرتی ہوئی گائے، بھینس کا نظر بچا کر دودھ دوہنا یا کسی آوارہ گدھے کے گلے میں اپنا ازار بند ڈال کر اس پر سواری کرنا بہت بڑی تفریح تھی۔ پڑھائی میں چھٹی جماعت تک تو لائق ہی شمار ہوتا تھا۔ میں اور میرا دوست قیصر اقبال چھٹی جماعت میں مشترکہ طور پر سیکنڈ آئے تھے۔ اس سے پہلے اچھی املا پر چوتھی کلاس میں سکول کے مالک میاں شریف خالد سے ایک روپے کا نیا کڑکتا نوٹ انعام میں بھی مل چکا تھا۔ البتہ بعد میں ایسا ہی انعام اگر رشید حسن خاں سے مل جاتا تو کیا ہی بات ہوتی۔ بیڑا غرق اگلی چار جماعتوں میں جا کر ہوا جب دماغ میں رومانس جگہ بنا چکا تھا۔ 76-1975 میں جیسے تیسے میٹرک کیا اور حصول رزق حلال کو عین عبادت سمجھتے ہوئے ٹائپنگ سیکھی۔ اسی دوران کتابیں پڑھنے کا جنون بھی پنجاب پبلک لائبریری تک لے گیا۔ پنجاب پبلک لائبریری کا رستہ دیکھنے سے پہلے سمن آباد کی چھوٹی مارکیٹ میں واقع ورائٹی بک سٹال اینڈ جنرل سٹور کی پرائیویٹ لائبریری من پسند کتابوں کے حصول کا واحد بڑا ذریعہ تھی۔ کتابیں تو والد صاحب کے پاس بھی بہت سی تھیں لیکن ہماری سمجھ سے آگے، ہماری پہنچ سے دور، تالے چابی میں محفوظ۔ یہ اور بات ہے کہ جب میرا نشہ ٹوٹتا تو میں تالے چابی کا بھی علاج کر لیتا اور "یادوں کی برات" تک جا پہنچتا مگر ایسا کم کم ہوتا تھا۔ لائبریری کی سیکورٹی پانچ، دس روپے تھی اور کرایہ فی کتاب 10 پیسے روزانہ تھا۔ کتابیں پڑھنے کی سپیڈ فیروزسنز

کے شوروم پر کھڑے کھڑے کتابیں پڑھ کر ایسی بنائی تھی کہ دو تین گھنٹے میں کتاب پڑھ کر وہ ماری۔ باقی دن اور کیا پڑھوں؟ اس مسئلے کا حل ایسے نکالا کہ ایک فرضی ''باجی فاطمہ'' کے نام کا لائبریری کارڈ بنوایا۔ نام جان بوجھ کر پکا اسلامی سا رکھا تاکہ سُنی ہو یا شیعہ بہرصورت احترام کرے۔ پہلی کتاب صبح نو دس بجے جا کر جاری کروائی بارہ ایک بجے یہ کہہ کر واپس کر دی: ''باجی کہتی ہیں یہ پڑھی ہوئی ہے'' باجی کے نام پر دکاندار کچھ سخت کہنے سے گریز کرتا اور دوسری کتاب جاری کر دیتا۔ شام چار بجے یہ کتاب بھی یہی کہہ کر واپس کر دی جاتی کہ باجی نے پڑھ رکھی ہے۔ اس طرح ایک دن میں، دس پیسے میں تین کتابیں پڑھنے کا جو سواد تھا وہ اب کہاں ملے گا۔ سائیکل کے ہینڈل پر بھی کتاب رکھ کر پڑھی ہے، پیدل چلتے ہوئے بھی۔ تمام بڑے بڑے لکھنے والے پڑھ ڈالے یہ سوچے بغیر کہ ایک دن مجھے بھی رائٹر بننا ہے۔ مجھے رائٹر بنانے میں سرمے والی سرکار کا بڑا ہاتھ ہے۔ جب میں پنجاب پبلک لائبریری میں روزنامہ ''مساوات'' اور ''امروز'' کے اُدھ پچدے حصے خالی خالی دیکھتا تو وہاں کھڑے اخبار پڑھنے میں مصروف بزرگوں سے دریافت کرتا کہ اگر خبریں کم پڑ گئی ہیں تو یہ لوگ اخبار شائع کیوں کرتے ہیں؟ لوگ بتاتے کہ خبریں کم نہیں ہوئیں حکمران کم ظرف اور کسی مُلا کی اولاد ملا ہے۔ بھینگا ہونے کے باوجود اُس کی فوٹو تو نمایاں کر کے لگانے کا حکم ہے مگر جس ذہین خوبرو کا تختہ اُلٹ کر اس نے اقتدار سنبھالا ہے اُس کی تصویر اور خبر لگانا جرم اور سختی سے منع ہے۔ جن اخبارات پر اُسے ذرہ برابر بھی شک ہے اُن پر اُس نے فوجی بٹھا رکھے ہیں۔ فوجیوں کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں کیا خوب اضافہ ہو رہا ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری ہی تھی جہاں بھٹو کی پھانسی کا ضمیمہ جس کی پیشانی پر ''نوائے وقت'' لکھا تھا، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا کر گیا جو بعد ازاں پوری قوم کے لیے کھوجک سرنگ جیسا اندھیرا اور اندھیرا ثابت ہوا۔ 4 اپریل 1979 کو ہی میں نے قسم کھائی کہ ضیاع الحق تجھے ساری زندگی کبھی معاف نہیں کروں گا۔ استنجے کے لیے بھی جو ٹشو پیپر استعمال کروں گا اُس پر تیری خیالی تصویر ہوگی۔ میرے اندر رائٹر 19 سال کی عمر میں ہی برآمد ہو گیا تھا۔ اگر حالات، واقعات کسی کمسن کو قاتل بنا سکتے ہیں تو رائٹر بھی بنا سکتے ہیں۔ میں نے ''غازہ خور'' کے نام سے ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ نوکری کے سلسلے میں پہلی بڑی کامیابی اپنے والد کی وفات کے دو ہفتے بعد پیکیجز کی نوکری تھی۔ ''غازہ خور'' والی ڈائری دھری کی دھری رہ گئی۔ پیکیجز کی نوکری میں اور کچھ کرنے یا سوچنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

1992 میں دی بنک آف پنجاب کی نوکری نے مالی اور ذہنی سکون عطا کیا۔ گرد و پیش دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے ہر طرف کم از کم گریجویٹ دیکھ کر احساس ہوا کہ صرف میٹرک تعلیم کافی نہیں اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ گلبرگ کے L بلاک میں رہتا ہے۔ میٹرک سے ایف۔اے اور پھر بی۔اے تک تو دوڑ لگالی۔ عین ممکن تھا کہ ابن صفی کی طرح اسے آخری سٹاپ سمجھتے ہوئے تعلیمی بس سے اُتر جاتا مگر اُس وقت میری ماں مینارۂ نور بن کر میرے سامنے آئی۔ انہوں نے قرآن پاک کا دو سالہ کورس ترجمے کے ساتھ کامیابی سے مکمل کر لیا اور امیر خواتین کے گھروں میں جا کر قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھانے کا سلسلہ عملی طور پر شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ابھی اور پڑھنا چاہیے۔

4 اپریل 1995 میں میرا پہلا ناول: ''غازہ خور'' شائع ہو گیا۔ سوچا تو یہ تھا کہ یہ ناول ضیاع الحق کے مونہہ پر جوتے کی طرح مار کر خود ٹھنڈا ہو جاؤں گا۔ مگر کارخانۂ قدرت میں انسان کا اختیار برائے نام ہی ہے۔ ناول HIT ہو گیا اور قارئین کا اصرار بڑھا کہ وہ

مجھے مزید پڑھنا چاہتے ہیں۔ دی بنک آف پنجاب کا علمی ماحول میرے بڑا کام آیا۔ پیکیجز کے زمانے سے سخت محنت کی عادت تھی جس کے مقابلے میں یہاں کام آسان لگا اور لکھنے لکھانے کے لیے وقت نصیب ہوا۔

2005 میں جب میرے ایم۔اے (اُردو) کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں تو مجھے بنک چھوڑنا پڑا۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے مجھے PTV کے پروڈیوسر شوکت زین العابدین نے اپنا مشہور پروگرام: ''زاویہ'' کتابی صورت میں لانے کا پروجیکٹ سونپ دیا۔ میرے پاس کم وبیش نو مہینے کا وقت تھا۔ اشفاق احمد کی پہلی برسی (7 ستمبر 2005) پر ''اشفاق احمد کا زاویہ'' مارکیٹ میں آئی تو صرف 4 دن میں پورا ایڈیشن نکل گیا اور کتاب مارکیٹ نے مجھے رائٹر کے ساتھ ساتھ پبلشر بھی مان لیا جواب تک 60 ہزار سے اوپر فروخت ہو چکی ہے۔

میں احسان اور خوشی یاد رکھنے والا انسان ہوں باقی سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہوں۔ سٹار VIRGO ہے اور زیادہ دوست بھی اسی سٹار سے تعلق رکھتے ہیں۔ سنبلہ کا نشان عورت ہے اور یہی عورت میری زندگی پر چھائی ہے۔ کہیں مثبت انداز میں اور کہیں منفی انداز میں۔ قناعت پسندی اپنے والدین سے پائی اور کتاب دوستی بھی انہی سے۔ ایک ریڈر کا رائٹر بننا زمین کے مدار سے نکل کر چاند کی طرف جانے کے برابر ہے۔ منٹو افسانے کا سب سے بڑا نام ہے میں اس بات کا قائل پنجاب پبلک لائبریری میں منٹو کو پورا پڑھنے کے بعد 70 کی دہائی ہی میں ہو چکا تھا۔ اَدب اور سیاست میں میرے دو ہی عشق ہیں: منٹو اور بھٹو۔ اب فیض بھی ان دونوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے لگا ہے مگر اب عشق کی عمر ہی نہیں رہی۔

میرا سب سے پہلا شوق فوٹو گرافی تھا مگر اس زمانے میں رنگین تصاویر پرنٹ کروانے پر خاصا خرچہ اُٹھ جاتا تھا اور دوڑ بھی YASHIKA سے آگے نہ لگا سکا۔ اس لیے وہ شوق پس منظر میں چلا گیا۔ فوٹو گرافی اور سیر وسیاحت تو آپس میں جڑے ہوئے تھے مگر چہرہ نہ یونانی تھا نہ ایرانی محض پاکستانی تھا اس لیے سیر وسیاحت کا شوق باقی رہ گیا۔ تصویریں اُتارنے اور اُتروانے کو خیر باد کہہ دیا۔ پھر بھی کبھی کبھی کیمرہ دیکھ کر جی ضرور مچل اُٹھتا ہے۔

لاہور یا ہو اور اُسے کھانے پینے کا شوق نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ کھانے کا بھی شوق ہے کھلانے کا بھی شوق ہے اور خود پکانے کا بھی۔ مچھلی کھانے کا اتنا شوق ہے کہ تازہ تو تازہ کراچی سے خشک مچھلی (جھینگے، چھوٹی بام مچھلی) تک منگوا کر کھا جاتا ہوں۔ پورے پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں نارنگ منڈی کا چاول مشہور ہے اور مجھے نارنگ منڈی میں مشہور میرے دوست ملک اشفاق نے کر رکھا ہے میری کتابیں مجھ سے خرید کر اور چاول کے زمینداروں اور رائس شیلرز کے مالکان کو تحفے میں دے دے کر۔ پنجاب بنک نے مجھے جو دو چار اچھے دوست دیئے ملک اشفاق اُن میں سے ایک ہے۔

اَدب میں جو نئے خیالات اور نظریات لے کر آیا تھا اُن کی روشنی میں رائٹر اور قاری کے درمیان سے پردہ ہٹا دیا۔ اپنی ہر کتاب پر پتہ اور فون نمبر دیا تاکہ قاری بھی اپنے جذبات واحساسات کا کھل کر اظہار کر سکے اور اُسے پتہ چلے کہ رائٹرز بھی عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ چاند کی مخلوق نہیں۔ یہ عمل دوسرے رائٹرز کی نظر میں اچھا ہے یا بُرا؟ لیکن میری حد تک تو یہ بہت مثبت ثابت ہوا۔ مجھے اپنی خوبیوں، خامیوں کا پتہ چلا اور تحریر کو بہتر بنانے میں خاصی مدد ملی اور ڈاکٹر طارق سلیم مروت جیسے ادب نواز اور مخلص دوست

ملے۔جس طرح سیاسی پارٹیاں اپنے VOTE BANK پر انحصار کرتی ہیں اسی طرح پہلی کتاب سے لے کر آج تک میرا اپنے ریڈرز پر اعتماد اور انحصار ہے۔میرے اور ریڈر کے درمیان پبلشر جیسا تھرڈ مین یا ولن ابھی تک حائل نہیں ہو سکا۔

ماں باپ کے بعد میری تربیت میں پیکیجز اور پنجاب بنک کا بڑا حصہ رہا ہے۔پیکیجز نے مجھے محنت کرنا اور صلے کی امید نہ رکھنا اور پنجاب بنک نے کسی پر اعتماد کر کے اپنے اعتماد میں اضافہ کرنا سکھایا۔اس کے علاوہ وسیع مطالعے کے دوران ایک جملہ جو میری زندگی بدل گیا وہ یہ تھا: ''جذباتی لوگوں کی زندگی اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو انہیں غصہ دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں'' اس جملے پر ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد اپنی گرفت اور اصلاح کی تو بہت کچھ ٹھیک ہو گیا اور اس کی افادیت میری زندگی پر چھا گئی۔ اسی طرح آج کل ایک جملہ میرے دماغ میں تجرباتی مراحل سے گزر رہا ہے: ''زبان کے زیادہ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ دماغ ہڑتال پر ہے''

رائٹر کا اصل کام ہی ریڈر کو مثبت سوچ دینا ہے یا ایسی اپروچ کا مالک بنا دینا جس سے ریڈر، رائٹر سے بھی آگے بڑھ کر سوچ سکے۔علم و دانش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں کسی پر بند نہیں ہوتے مگر بندہ داخل ہونے کی ہمت تو کرے یا پھر ''بہشتی دروازے'' کی طرح محض ایک بار داخل ہونے کو ہی بہت کافی نہ سمجھے۔

انسان کو اپنی زندگی میں موت کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔یہی سوچ کر نور پور سکول، جوئیاں والا موڑ، شیخو پورہ میں اپنے نام کا ''بک کارنر'' بنوا دیا ہے تا کہ مرنے کے بعد میری جمع شدہ کتابیں کسی کباڑیے کے ہاتھ نہ لگیں۔اس ''بک کارنر'' میں غلام حسین غازی جیسے ''عاشقِ کتب'' کا اعترافِ محبت بھی شامل ہے۔منٹو نے تو اس حوالے سے اپنا ''کتبہ'' بھی لکھا تھا:

۸۶ک

''کتبہ''

یہاں سعادت حسن مَنٹو دفن ہے۔اُس کے سینے میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

سعادت حسن مَنٹو

۱۸/اگست ۱۹۵۴

مَنٹو تو دلیر اور دبنگ تھے مگر اُن کے اہلِ خانہ جانے کس مصلحت کے تحت مذکورہ بالا مضمون کا ''کتبہ'' مَنٹو کی قبر پر نہ لگا سکے۔ میری آج بھی یہ خواہش ہے کہ مَنٹو کی علامتی قبر اس کتبے کے ساتھ، اُردو زبان کی حدود میں نمایاں جگہوں پر بنا دی جائے کیونکہ مَنٹو اُردو زبان کی اہم ترین شخصیت تھے۔

میں اپنے وارثوں اور پرستاروں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری قبر کا ''کتبہ'' اس مضمون کا بنایا جائے:

''عرفان احمد خان نام ہے اُس انسان کا جو اس قبر میں دفن ہے جو ماں کی کوکھ سے آزادی کو سب سے بڑی نعمت، تعلیم کو سب سے بڑا اثاثہ، دنیا کو سب سے بڑی آزمائش اور انسانیت

کو اپنا مذہب سمجھتا تھا''

عرفان احمد خان

۶ ستمبر ۲۰۱۴

کتاب کے عشق میں اس قدر مبتلا ہو چکا ہوں کہ خواب میں بھی کتابوں کے ٹائٹل اور دیگر اشاعتی مراحل دکھائی دیتے ہیں۔ قریبی رشتہ داروں سے تعلق اور دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔ دور کے رشتہ داروں پر تو پہلے ہی ''دفعہ دور'' لگا رکھی ہے۔ کتابوں کی دنیا میں بہت کچھ کر دکھانے کی ہمت اور خواہش ہے۔ سمندر میں تیرتے گلیشیر کی طرح تخلیقی طور پر جتنا دکھائی دیتا ہوں اُس سے کہیں زیادہ نظروں سے اوجھل ہوں۔ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ دینا چاہتا ہوں۔ اپنی حد تک بہت مطمئن ہوں مگر مرنے کے بعد بھی اپنے نام کے فیض کو جاری رکھنا میری شدید ترین خواہش ہے۔

قارئین کی اکثریت تجسّس پسند ذہنیت کی حامل ہوتی ہے وہ اپنے پسندیدہ رائٹر کے بارے میں روٹین سے کچھ ہٹ کر جاننے کی خواہش رکھتے ہیں تو ایسے قارئین کو خوش کرنے کے لیے میں اپنی زندگی کی روٹین سے ہٹ کر کچھ باتیں بتاتا ہوں۔ مثال کے طور پر مجھے کھٹی چیزیں کھانے کا کریز ہے۔ کئی خواتین دوست مجھ سے کھٹا کھانے کی شرطیں ہار چکی ہیں۔ لیموں دیسی ہو یا چائنیز چھلکے سمیت کھا جاتا ہوں۔ آدھا کلو املی کھا جانا میرے لیے معمولی بات ہے اور کلوڈیڑھ کلو کیری کھا جانا آم سی بات ہے۔ پیکیجز کے زمانے میں ریڑھی پر کھڑے ہو کر، برف کے بلاک پر لگے ہوئے قندھاری انار کے ساڑھے تین کلو دانے کھڑے کھڑے کھائے۔ دیسی انڈے کچے پینے کی عادت اپنے گھر میں دیسی مرغیاں پالنے سے لگی اور مرغیاں ختم ہوتے ہی چھُٹ بھی گئی۔ مجھے بھی بینا کماری کی طرح باسی روٹی، باسی کھانا تازے کھانے جیسا مزا دیتا ہے۔ بچا کھُچا کھانے والی درویشی صفت خدا جانے مجھ میں کیسے آ گئی مگر اس کا فائدہ بہت ہے۔ اندرا گاندھی تو واش روم میں کموڈ پر بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتی تھیں، میں نے نا صرف کتابیں پڑھیں بلکہ ناولوں کے ڈائیلاگ اور کتابوں کے اہم نکات باہر والوں کو ہنگامی طور پر DICTATE بھی کروائے۔ اس پہلو سے مجھے DICTATOR بھی کہا جا سکتا ہے ورنہ ہر معاملے میں جمہوریت/ترقی پسند ہوں۔

کسی بھی جگہ نیند پوری کر لینا، جو بھی ملے کھا لینا یا جتنا مرضی شور ہو سہولت سے لکھ لینا یہ وہ آسانیاں ہیں جو اللہ نے میرے اندر قدرتی طور پر ڈال رکھی ہیں ورنہ انہیں خود میں پیدا کوئی نہیں کر سکتا۔ بے چین فطرت، کئی معاملات میں ابنارمل ہونا تو ہر تخلیق کار کی مشترکہ خصوصیت کہی جا سکتی ہے، مجھ میں بھی ہے۔ لیکن کسی بھی انسان کو پرکھنے کا اصل پیمانہ اُس کا مثبت یا منفی ہونا ہے۔ اپنے بارے میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جتنی زندگی گزری ہے اُس میں مثبت طرزِ عمل کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے اگر کہیں منفی ہونا پڑا تو اکیلے میں اُس پر شرمسار بھی ہوا اور کبھی کبھی براہ راست معافی بھی مانگی۔ اَنا میری نظر میں جوئے کی بیٹھک چلانے والی وہ دھڑلے دار خاتون ہے جسے کبھی گھاٹا نہیں ہوتا۔ خسارے میں ہمیشہ اُس کے گھر کھیلنے والے ہی رہتے ہیں۔ تفریح ہر چھوٹے بڑے کی لازمی ضرورت ہے کسی زمانے میں مجھے بھی لاہور کے سینماؤں میں لگنے والی ہر زبان کی فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جمعہ کو نئی فلم لگتی تھی۔ جمعہ کے دوران اگر مولوی صاحب چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی فارغ کر دیتے تو میں اور میرا دوست قیصر اقبال یہی تبصرہ کرتے:

''لگتا ہے مولوی صاحب نے بھی آج فلم دیکھنی ہے'' قریب قریب لاہور کے ہر سینما گھر میں فلم دیکھنے کا ٹارگٹ پورا ہو گیا تو لاہور کی ہر مسجد میں نماز پڑھنے کا ٹارگٹ بنالیا مگر مساجد اور مسالک کی تعداد آڑے آئی اور یہ پروجیکٹ ادھورا رہ گیا۔

بڑے لوگوں سے ملنے اور اُن کے آٹوگراف لینے کا بھی شوق تھا۔ نامور خطاط صادقین، اسکوائش چیمپئن جہانگیر خان اور کرکٹر جاوید میانداد کے آٹوگراف ابھی تک محفوظ ہیں۔ باقی دوستوں کو دے دلا دیئے۔ ڈائجسٹوں کے مشہور رائٹر طاہر جاوید مغل بھی میرے دوستوں میں سے ہیں۔ اُن کے پاس اکثر اس لیے جاتا ہوں کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کا کچھ تو پتہ چلے۔ مگر طاہر جاوید مغل مجھے گوگا نقیبیہ (شاہنور سٹوڈیو) کے مشہور نان چنے کھلا کر میری تحقیقات کا مونہہ بند کر دیتے ہیں۔ مغلوں کے بارے میں نہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کچھ بتاتے ہیں نہ ہی فوزیہ مغل۔ آخر کہاں جاؤں میں؟ ٹکٹیں جمع کرنے کا جنون بھی پانچ، دس سال چلا۔ آوارہ گردی کا شوق پہلے سائیکل پر لاہور کا کونا کونا دیکھ کر پورا کیا اور مجھے میرے والد نے یہ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا: ''تم تو لاہور کو مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہو'' والد صاحب کا یہ جملہ اکثر مجھے مسرور کر دیتا ہے۔

ایگل سائیکل کے بعد 1982 میں HONDA 70 میری رانوں تلے آ گئی اور میری رینج لاہور کی شہری حدود سے نکل کر جانے کہاں کہاں تک پھیل گئی۔ اگر میں بائیک پر ایک طرف کراچی تک گیا تو دوسری طرف پشاور اور کوہاٹ تک بھی گیا۔ جب کہ HONDA 125 پر میں نے جھیل سیف الملوک اور شوگران جیسا مشکل سفر رائٹر دوست شرجیل تصور کے ساتھ کیا۔ میں تو اس جملے: NO PAIN NO GAIN کا قائل ہوں۔ گھر بیٹھے انسان کو بہت کم خوشیاں ملتی ہیں باہر نکلنا ہی پڑتا ہے خوشیوں کی تتلیاں پکڑنے کے لیے بالخصوص مرد کو۔ گھر بیٹھے تو تاش کھیل کر ہی خوشی ملتی ہے یا وہ خوشی جس کا آغاز شادی ہال بک کروانے سے ہوتا ہے۔ T.V دیکھنے کو میں قابلِ ذکر خوشیوں میں شمار نہیں کرتا T.V تو اصل میں وہ بنیا ہے جو آپ کے گھر میں دکان لگا کر بیٹھ گیا اور اپنا وہ مال جس کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں، آپ کی ضرورت بنا کر بڑی چالاکی سے فروخت کر رہا ہے۔ بیچ بیچ میں ڈراما، گانا، فلم یا میچ آ جاتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ اخبار کے ساتھ بھی ہے۔ وہ بھی ہر بات کو خبر کہنے یا سمجھنے پر اصرار کرتا ہے اور فرنٹ پیج کو دیواری پوسٹر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ عام آدمی کے لیے خوشی کی خبر نہ T.V پر ہے نہ اخبار میں۔ یہ سب پیٹ بھرے تماشے ہیں۔

دو درجن کتابوں کا مصنف اور مرتب اوپر سے ناول نگار طول بیانی سے کہاں باز رہ سکتا ہے مگر پورٹریٹ کی طوالت ایک حد سے آگے نہیں جا سکتی اس لیے خاکے کے نام پر لکھی ہوئی اس تحریر کو میری 7 کلر آٹوبائیوگرافی ''اَب خاک اُڑے گی'' کا SYNOPSIS سمجھا جائے تو زیادہ منصفانہ بات ہوگی۔ ریڈر کو نہ پہلے کبھی دھوکا دیا ہے نہ اب دوں گا۔ اگر میں اپنی آٹوبائیوگرافی کا بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ اسلامی ایڈیشن لایا تو اُس کا نام: ''تفہیم العرفان'' ہوگا۔

میرے خیال میں ہر کوئی اس دنیا میں اپنے ہمزاد کی تلاش میں ہے، میں بھی ہوں۔ اس دنیا کا سچ یہی ہے کہ بُرے سے بُرا آدمی بھی گھوم پھر کر خود اپنے جیسا ہی ہونا چاہتا ہے۔ پہلے انسان اس ساری دنیا سے خوفزدہ تھا آج یہ ساری دنیا انسان سے خوفزدہ ہے۔ ہے نا حیرت کی بات!

رقصِ طاؤس

''بڑے بڑے اعلیٰ سرکاری افسران اپنی رانی توپ جیسی بیگمات میرے حوالے کر کے کہتے تھے کہ میں انہیں ''مادھوری'' بنا دوں'' یہ بیان ہے ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کا، جن کا خاکہ میں اس وقت لکھنے چلا ہوں۔ دُنیا، ساگا کو محض ایک ڈانسر کے طور پر جانتی اور مانتی ہے مگر بحیثیت بزرگ دوست میں نے انہیں جیسا پایا، وہ بہت باکمال شخصیت تھے۔ بے پناہ خوبیوں کے مالک اور سب سے بڑھ کر انسان دوست اگر اُن کے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' نہ بھی لگا ہوتا تو فقیر حسین ساگا کے نام کے ساتھ بھی وہ کچھ کم نہیں تھے۔ ڈاکٹر وہ نہ ایم۔بی۔ایس تھے نہ Ph.D نہ ہی ہومیو پیتھک کی آڑ میں شکار کھیلنے والے ڈاکٹر عامر لیاقت حسین جیسے جعلی ڈاکٹر۔ وہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ڈاکٹر گلکرسٹ کی طرح ڈنگر ڈاکٹر تھے، جو محض اُن کا ذریعہ روزگار اور گھر کا راشن تھا۔

ڈاکٹر ساگا بتاتے تھے کہ انہوں نے گھوڑا ہسپتال، لاہور (موجودہ یونیورسٹی) میں طالب علموں کو پوری توجہ اور سنجیدگی سے اپنے مخصوص انداز میں پڑھایا تو روایتی استاد مجھ سے حسد کرنے لگے، طالب علموں کی زبانی میری تعریفیں سن کر۔ کبھی میں اُن کے حصے کا بھی پڑھایا کرتا تھا۔ پھر انہوں نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ مجھے کوئی پیریڈ نہیں دیا جائے گا۔ مجھے ہر حال میں خوش اور مصروف رہنا آتا تھا سو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ فائدہ ہی ہوا۔

ڈاکٹر ساگا کے ساتھ جب میری دوستی ہوئی تو اُن کے پاس سکوٹر تھا اور میرے پاس بائیک اور میں پنجاب بینک میں ملازم تھا۔ جہاں کے G.M ایڈمن ڈاکٹر آصف حفیظ شیخ اُن کے رشتہ دار تھے۔ پنجاب بینک میں بھی ڈاکٹر ساگا کو بہت سے لوگ جانتے تھے۔ خوش اخلاق اور ملنسار، اگر فنکار بھی ہو تو کون نہیں ملنا چاہے گا؟ ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کا ذاتی گھر اسلامیہ پارک میں میرے گھر اور دفتر کے درمیان تھا اس لیے دفتر سے واپسی پر تو اکثر اور کبھی کبھی صبح دفتر جاتے ہوئے بھی ساگا صاحب سے ملاقات ہو جاتی۔ لوگوں میں تو ساگا صاحب، مستنصر حسین تارڑ کی طرح کنجوس مشہور تھے مگر جانے کیوں میری بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ مجھے اپنے آرٹسٹک ہاتھوں کے ساتھ چائے کے اس خاص برتن میں چائے بنا کر پیش کرتے تھے جس میں صرف 2 کپ چائے ہی بنتی تھی۔ برتن لبنان کا بنا ہوا تھا۔ چائے لپٹن کی ہوتی تھی جو ہم لیٹنے کے بعد پیتے تھے۔ بھولے بھٹکے ٹوٹے پھوٹے بسکٹ بھی آجاتے اور کبھی کبھار رشید بیکری سے نمکو اور سموسے بھی۔ مگر سب پہ غالب رنگ اُن کی دلچسپ اور معلوماتی باتوں کا ہی رہتا۔

وہ بہت بے تکلف انسان تھے اس لیے مجھ سے اکثر گرمیوں میں یوں ملتے کہ جسم کا اوپری حصہ ننگا ہوتا اور شلوار بھی وہ اپنے گھٹنوں تک اونچی کر لیتے۔ اُن کا جسم بہت چکنا اور غیر ضروری بالوں سے پاک تھا، پیٹ معمولی سا نکلا ہوا تھا۔ اپنے ڈرائنگ روم کا سیمنٹ والا ٹوٹا پھوٹا فرش خود مجھے دکھا کر کہتے: ''اے ویکھ، شاگرد کڑیاں نے اَڈیاں مار مار کے توڑ چھڈ یا اے''

ڈاکٹر ساگا اور مجھے، ہمارے مشترکہ پیارے دوست ڈینٹسٹ ضمیر الحسن ڈار نے AVARI میں بوفے دیا وہیں اسی دوران ساگا صاحب نے ہمیں بتایا کہ پاکستان کے ساتھ ایک بہت بڑا ظلم پاکستان کے سفیر برائے ہندوستان ہمایوں کبیر نے کیا۔ اُس نے موئن جوڈرو سے نکلی ہوئی DANCING GIRL والی مورتی جو اصل میں کانسی کی تھی اور اس زمین پر رقص کی اوّلین شہادت تھی،

ہندوستان کی حکومت کو یہ کہتے ہوئے بخش دی: ''رقص تو آپ کا مذہب ہے ہمارا ڈانس سے کیا تعلق'' ہندوستان، ہمایوں کبیر کی اس احمقانہ حرکت سے انتہائی خوش ہوا۔ اصل کانسی کی مورتی لے کر سات پردوں میں چھپا دی جب کہ موئن جودڑو کے میوزیم میں DANCING GIRL کی پتھر پر بنی نقل پاکستانیوں کا مونہہ چڑا رہی ہے۔ یہ وہ قومی نقصان ہے جس کا جواب ہم سے آنے والی نسلیں ضرور لیں گی۔ یہ مورتی اپنی قیمت میں کوہ نور ہیرے کی برابری کرتی تھی جو ایک احمق سفیر کی حماقت سے دشمن کے پاس چلی گئی۔

اُن کے گھر میں تو اُن کی شاگردوں کو میں نے بہت کم دیکھا۔ ویسے بھی اپنے گھر میں ہر شریف انسان گیدڑ ہوتا ہے۔ اُن کا اصل ڈیرہ شاکر علی میوزیم، گارڈن ٹاؤن، لاہور تھا جہاں وہ ڈانس کی کلاسز لیتے تھے۔ وہاں قاضی جاوید جیسا ٹھرکی بھی کبھی کبھار بہانے سے آجاتا اور یہ کہہ کر اپنی سری اندر ڈالتا: ''ساگا صاحب! میں سبزی لین نکلیا سی، سوچیا ساگا صاحب نوں وی مل لیئے'' ساگا صاحب جانتے تھے کہ قاضی جاوید اصل میں کیا دیکھنے اور کس کو ملنے آیا ہے۔ رقص کے ابتدائی اُردو، پنجابی اسباق کچھ یوں ہوتے تھے:

تھوڑا ادائیں دیکھو
تھوڑا ابائیں دیکھو
تھوڑا آگے دیکھو
تھوڑا پیچھے دیکھو
سجّا پیر
کھبا پیر
اوہدے بعد اُڈی

کبھی کبھی لفظ ''تہکار'' بھی سننے میں آیا مگر مجھے اس کے معنی معلوم نہیں۔ ڈانس کرنا، ڈانس سکھانا اُن کی اضافی آمدنی ضرور تھی مگر فن سے محبت سب سے برتر تھی۔ اور یہ آمدن اُن کی محنت کا وہ پھل تھی، جو ہر ریاضت کرنے والے کو کبھی نہ کبھی ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ گداگروں کا سڑک کنارے بیٹھنا اک ریاضت ہی تو ہے جو ایک دن بیٹھے بیٹھے اُن کو لکھ پتی بنا دیتی ہے۔

اسلامیہ کالج، سول لائنز کے جریدے ''فاران'' (سلور جوبلی نمبر 1986) میں ڈاکٹر فقیر حسین ساگا رقم طراز ہیں: ''میں 1954 سے 1959 تک اسلامیہ کالج میں بی۔ ایس سی کا طالب علم رہا ہوں۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے بی۔اے۔ بی۔ ایس سی کی کلاسیں اسلامیہ کالج، سول لائنز میں منتقل ہوئیں۔ اس زمانے میں کالج کا ماحول نہایت شریفانہ تھا۔ آج کل کی طرح ہنگامہ آرائی کا تصور بھی نہ تھا۔

میں کالج کی ڈرامیٹک کلب کا فعال رکن تھا اور اُس کی سٹیج سے ہر فنکشن میں رقص کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم جو اس وقت پرنسپل تھے، سٹیج کے پیچھے تشریف لائے اور مجھے شاباش دی۔ 1959 میں کالج کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کے موقع پر مجھے خصوصی ثقافتی انعام مہمانِ خصوصی جنرل محمد اعظم خان کے ہاتھوں ملا۔ تعلیمی، ادبی اور ثقافتی روایات میں اس کالج کا مقام نہایت اعلیٰ رہا ہے اور بڑی بڑی سیاسی ادبی اور سرکاری انتظامیہ سے متعلق شخصیات اس درس گاہ سے

فارغ التحصیل ہوئی ہیں۔جس وقت مجھے جنرل محمد اعظم خان انعام دے رہے تھے۔حاضرین محفل زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم اور خواجہ اسلم مرحوم پیش پیش تھے۔اُن کے مسکراتے چہرے اور تالیاں بجاتے ہاتھ مجھے کبھی نہیں بھولے'' ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق یہ ساگا صاحب کے فن رقص کے سفر کا ایک شاندار آغاز تھا۔

ساگا صاحب بتاتے تھے کہ ڈانس سیکھنے کی خاطر انہوں نے بہت ماریں کھائیں۔اُن کے کاسٹیوم جلا دیئے گئے۔انہیں ہیجڑا ہونے کا طعنہ دیا گیا۔کیا کچھ نہیں کہا گیا اُن کو۔مگر انہوں نے فن پر کمال حاصل کر کے ہی چھوڑا۔اپنے تو اپنے، پرائے بھی اُن کے گھر کے باہر لکھ جایا کرتے تھے:''یہ ناچ کا گھر ہے''ڈاکٹر فقیر حسین ساگا، اس جملے کو مٹانے کی بجائے یہ اضافہ کر دیا کرتے تھے:''جوکہ تمہارا ہمسایہ ہے'' پڑھے لکھے اور جاہل میں بس یہ فرق ہوتا ہے۔رفتہ رفتہ خواندگی بڑھی اور شرارتی لڑکے بالے یہ لکھنا چھوڑ گئے۔

ایک مرتبہ انہوں نے قریبی مسجد میں نماز کی امامت کرنے کی کوشش کی تو اُن کے کلین شیو ہونے اور باڈی لینگویج کو دیکھتے ہوئے اُن کی امامت میں لوگوں نے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔اس کے بعد انہوں نے نماز، روزے کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور اپنے فن میں پناہ لی جو اُن کی اصل پہچان تھا۔

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کسی کا جھوٹ بولنا قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے، چاہے جھوٹ بولنے والا ڈاکٹر انور سجاد ہی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر انور سجاد کسی تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔میں اور ڈاکٹر ساگا بھی موجود تھے۔ڈاکٹر ساگا نے ڈاکٹر انور سجاد کا کوئی جھوٹ پکڑا اور فوراً حاضرین کے درمیان اُٹھ کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر انور سجاد کو ٹوکتے ہوئے کہا:''حاضرین! ڈاکٹر انور سجاد بہ طور طالب علم گھوڑا ہسپتال میں مجھ سے سینئر تھے پھر فیل ہوتے ہوتے جونیئر ہو گئے اور پھر یہ لائن ہی چھوڑ کر ایم۔بی۔ایس ڈاکٹر ہو گئے''ڈاکٹر انور سجاد کا چہرہ بھی سُرخ ہوا۔انہوں نے منمناتے اور ہکلاتے ہوئے وضاحت کرنے کی کوشش تو کی مگر حاضرین کے ذہنوں میں ڈاکٹر ساگا کی بات اپنی جگہ بنا گئی تھی جس پر چوہدری شجاعت حسین کی طرح مٹی ڈالنا اب بے سود سی کوشش تھی۔

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا نے عمران خان کے شوکت خانم کینسر ہسپتال کے چیرٹی ڈنر میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔وہ چیرٹی ڈنر اس وجہ سے یادگار تھا کہ مہمانِ خصوصی لیڈی ڈیانا تھیں۔ساگا صاحب پُرفارمنس میں مست تھے اور میری پوری کوشش تھی کہ لیڈی ڈیانا سے قریب ہو کر ہاتھ ملایا جائے اور کوئی بات کی جائے۔آخر میری خواہش پوری ہوئی۔میں نے لیڈی ڈیانا سے ہاتھ ملایا۔اُن کی سمارٹنس کی تعریف کی تو لیڈی ڈیانا نے اپنے فگر کی پیمائش اور پاؤنڈز میں وزن بتا کر مجھے تو حیران ہی کر دیا۔لیڈی ڈیانا کے جسم کی پیمائش تو مجھے یاد رہ گئی مگر وزن ٹھیک سے یاد نہیں رہا جو سوا سو پاؤنڈز کے قریب قریب تھا۔لیڈی ڈیانا نے اپنے جسم کی جو پیمائش بتائی وہ یہ تھی۔35-25-36 اگر کسی کو اس بارے میں شک ہو تو وہ شہزادہ چارلس سے تصدیق کرنے کے معاملے میں آزاد ہے۔

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کا تقابل کتھک مہاراج سے کیا جاتا تھا جس پر ساگا صاحب بہت خفا ہوتے تھے۔مجھے بتاتے تھے کہ یہ بنگالی ایک بہروپیا ہے۔ڈانسر ہو گا کسی زمانے میں مگر ایک عرصہ ہوا اُسے کسی نے ڈانس کرتے نہیں دیکھا۔چونکہ پاکستان میں ہر 2 نمبر آدمی کی دال گل جاتی ہے اس لیے کتھک مہاراج کی بھی گُڈی چڑھی ہوئی ہے۔مہاراج کی محفل پُررونق اس لیے ہے کہ اُس کا کوئی بال

بچہ نہیں۔ میں کنجوس اس لیے مشہور ہوں کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میرا سب کچھ اپنے گھر پر ہی خرچ ہو جاتا ہے۔

یہاں ساگا صاحب کی اعلیٰ ظرفی ماننی پڑے گی کہ مجھے تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی غرض سے انہوں نے مجھے اُز خود کتھک مہاراج کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ شاید انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا تھا کہ میں سُنی سنائی پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ہر شخصیت اور نظریہ کے بارے میں اپنی رائے چھان پھٹک کے بعد خود قائم کرتا ہوں۔

یوں سمجھیں ساگا صاحب نے مجھے کتھک مہاراج کی طرف دھکیلا اور ایک روز شدید گرمی اور حبس زدہ موسم میں میرے قدم دہلی مسلم ہوٹل، انارکلی، لاہور کی جانب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں موازنہ انیس ؔو دبیر کرنے جا رہا تھا۔

واہ! کیا محفل تھی کتھک مہاراج کی۔ ہر طرح کا نشہ اور مشروبات وہاں چل رہے تھے۔ ہر ملاقاتی کو اُس کی پسند کا مشروب اور فواہکات پیش کیے جا رہے تھے۔ کتھک مہاراج گہرے سبز رنگ کی ساٹن کا ایک چوغہ پہنے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں بیس، پچیس مرد و زن موجود تھے۔ میں نے مہاراج کو تعارف کے لیے اپنا ناول: ''غازہ خور'' پیش کیا۔ جسے مہاراج نے دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور حاضرین کو دکھا کر، ایک طرف رکھ دیا۔

میں نے مہاراج کے ساتھ بے تکلف ہونے کی غرض سے اور حاضرین کو اپنی آمد کا احساس دلانے کے لیے ہیل وڑانچ کے پولے، بھولے اور ہولے سٹائل میں معصوم سا جملہ پھینکا: ''مہاراج یہاں کبھی چھاپہ بھی پڑا ہے؟'' مہاراج سمیت سبھی مسکرائے، کچھ ہنسے۔ مہاراج نے جواب دیا: ''ارے میاں یہاں ایسا ممکن نہیں۔ جانے کہاں ایسا ہوتا ہوگا'' اس کے بعد مہاراج نے جانے کس کے کہنے پر ایک منی لیکچر دیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسجد کے مینار اور گنبد اصل میں جنسی علامات اور استعارے ہیں۔ مینار، مردانگی کی اور گنبد نسوانیت کی۔ اس کے بعد مہاراج نے شاہین اور گدھ کے حوالے سے گفتگو کی اور گدھ کو شاہین کے مقابلے میں انسان دوست ثابت کیا جو انسان کے لیے مضر غلاظت کو کھا کو ماحول کر صاف کر جاتا ہے جبکہ شاہین نوخیز پرندوں کا شکار کر کے اُن کی نسلیں تباہ کرتا ہے۔ ویسے بھی مادہ شاہین کے شکار کا مقصد اپنے بچوں کو پالنا ہوتا ہے۔ نر صرف اپنی محدود ضرورت کے مطابق شکار کرتا ہے۔ حرص اور طمع مادہ شاہین میں ہوتی ہے وہ بھی اپنے بچوں کے لیے۔ میں نہ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، مجھے ٹھنڈا جوس بھی ملا اور گرم چائے بھی۔ اسی ملاقات میں ایک طوائف بھی کتھک مہاراج سے ملنے آئی وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آئی تھی جس کی ڈانس کی تربیت ہیرا منڈی میں شروع ہونے والی تھی۔ نوخیز لڑکی نے مہاراج کے چرن چھوئے۔ مہاراج نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے تکیے کے نیچے سے 5 کے نئے نوٹوں والی کاپی نکال کر اُسے شبھ کامناؤں کے ساتھ دی۔ طوائف، اُس کی بیٹی اور تمام حاضرین مہاراج کے اس عمل سے بہت متاثر ہوئے۔ طوائف نے مہاراج کی توجہ گرمیوں کی مناسبت سے اُن کے گرم لباس کی طرف دلاتے ہوئے کہا: ''مہاراج یہ لباس تو بدلیں'' مہاراج نے کہا: ''اگر یہ اُتار دوں تو نیچے کچھ بھی نہیں ہے'' مہاراج کی آنکھوں اور گفتار میں بنگال کا جادو بولتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میری رائے ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کے حق میں ہوگئی اور میرے دل سے تشکیک کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ کتھک مہاراج، ڈاکٹر فقیر حسین ساگا سے بھی پہلے اگلی دنیا سُدھار گئے مگر اپنا آپ، سیّد نور کی فلم: ''سرگم'' میں محفوظ کر گئے، جو اصل میں گلوکار عدنان سمیع خان نے زیبا بختیار کو قابو کرنے کے لیے فنانس کی تھی۔ فلم نے درمیانہ بزنس کیا اور اپنی لاگت مارکیٹ سے واپس لے لی مگر

عدنان سمیع خان نے زیبا بختیار کا قبضہ نکاح کے نام پر پکا لے لیا اور اپنا جی بھر جانے اور وزن نا قابل برداشت ہو جانے پر زیبا بختیار کو انسانی ہمدردی اور باقی ماندہ زندگی ہلکے پھلکے انداز میں بسر کرنے کے وعدے پر خود سے علیحدہ کر دیا۔

جب ڈاکٹر ساگا کو پتا چلا کہ کتھک مہاراج سے ملاقات کے بعد میرا ووٹ اُن کے حق میں ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے لے کر ڈیفنس میں پاکستان کے سب سے بڑے فراڈیئے محمود سپرا (سلمیٰ آغا فیم) کے گھر گئے۔ محمود سپرا مجھے ایک نظر دیکھنے میں ہی FUCKER سا لگا۔ مجھ سے اُس نے رسمی سا دو انگلیوں والا ہاتھ ملایا اور ساگا صاحب کو لے کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میرے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بھی دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ شیشے کی میز پر بے باک انگلش رسالوں کا ڈھیر لگا تھا جو دو چار گھنٹے وہاں بآسانی گزارنے کے لیے کافی تھے۔ گورنر ہاؤس کی طرح ہر آدھے گھنٹے بعد میری تواضع کسی نہ کسی چیز سے کی جاتی رہی۔ محمود سپرا کے پاس اُن دنوں کئی نوجوان اور پرکشش لڑکیاں اور لڑکے اعزازی طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے اس لیے کہ وہ اپنی فلم: ''سورج پہ دستک'' کی خبریں اخبارات میں لگوا چکا تھا۔ یہ وہ سبز مکھیاں تھیں جو آم کی خوشبو پر جانے کہاں سے آ جاتی ہیں۔

محمود سپرا نے عرب شیخوں سے ایک فراڈ میں لمبا پیسہ بٹورا تھا۔ اس نے عربوں کو یہ سنہرا سپنا دکھایا تھا کہ وہ اُن کے ملک میں گلیشیر لے کر آئے گا جو خالص ترین صاف پانی ہوگا۔ گلیشیر کو پلاسٹک کوٹنگ کی جائے گی اور اُسے پگھلنے سے روکنے کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی بروئے کار لائی جائے گی۔ اس کام کا ایڈوانس ہی کروڑوں ریال تھا جو محمود سپرا کھا گیا۔

ساگا صاحب، محمود سپرا کے بیڈ روم سے نکلے تو فلم کے لیے منتخب گانے کے بول گا رہے تھے: ''کشمیر توں لے کے مالاکنڈ......''

ساگا صاحب مشہور پارسی ڈانسر مادام آزوری کے شاگرد تھے۔ مجھے انہوں نے اپنی اُستاد اور اپنی شاگرد سے ایک ہی دن ملوایا۔ شاگرد فریال گوہر تھی۔ موقع فریال گوہر کی ٹیلی فلم: ''ٹبی گلی'' کی رونمائی کا تھا جس کا پریس شو امریکن سنٹر مرحوم میں رکھا گیا تھا۔ یہ آخری تقریب تھی جو میں نے امریکن سنٹر میں اٹینڈ کی۔ فلم کمال کی تھی۔ مادام آزوری نے بھی ''ٹبی گلی'' میں ایک رول کیا تھا اور بذات خود بھی حاضرین میں موجود تھیں۔ فریال گوہر بڑی پیاری تھی جو بعد میں جنرل مشرف کو پیاری ہو گئی۔ وہ تقریب مجھے آج بھی مسرور کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا نے بتایا کہ ایک بار اُن کی مردانگی کو شدید دھچکا اُس وقت لگا جب وہ ایک فلم ایوارڈز کی تقریب میں گلوکارہ تصور خانم کی عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔ تصور خانم اپنی سہیلی کے ساتھ اپنا کوئی تازہ ترین جنسی تجربہ شیئر کر رہی تھی: ''اڑی اے لگدا اے جیویں اجے تیکر جن چمڑیا اے بارھ نئیں نکلیا'' سہیلی نے تصور خانم کی توجہ بروقت ساگا صاحب کی موجودگی کے بارے میں دلائی تو تصور خانم نے ساگا صاحب کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا: ''چھڈ نی، ساگا صاحب تے اپنے ورگے نیں ایناں کولوں کی لُکانا''

ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کی دو شدید ترین خواہشیں تھیں ایک 'تمغۂ حُسن کارکردگی' پانا اور دوسرا اپنی کتاب: ''پنجاب کے لوک رقص'' پرنٹ کروانا۔ میں نے اُن کی یہ دونوں خواہشیں اپنے سامنے پوری ہوتی دیکھیں۔

میں بھی اُن پر ایک کتاب: ''ساگا کہانی'' لکھنا چاہتا تھا جس کی غرض سے چھوٹی کیسٹ والی ٹیپ ریکارڈر بھی خریدی۔ کچھ کیسٹیں ریکارڈ بھی پڑی ہیں مگر کتاب سے پہلے یہ خیال آیا کہ لکھنے کا خیال آیا اور اس پر عمل بھی ہو گیا۔ خود کو زنخا کہنے والوں کو مونہہ توڑ جواب انہوں نے 6 بچے پیدا کر کے دیا اور فن کے میدان میں اُن جیسا کوئی اور پیدا نہ ہو سکا۔ ناہید صدیقی کے شاگرد نگاہ حسین نے کچھ نام ضرور

پیدا کیا اس لائن میں مگر فقیر حسین ساگا جیسی بات کہاں۔ ساگا صاحب اس بات پر بہت جلتے، کڑھتے تھے کہ پاکستانی فلم ڈانس ڈائریکٹر اپنے نام کے ساتھ ''سمراٹ'' لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''سمراٹ'' ٹائٹل ہے جو متحدہ ہندوستان کے بہترین ڈانس ماسٹر کو بہت مشکل سے ملتا تھا۔ یہ اولاد کو ٹرانسفر نہیں ہوسکتا۔ جس طرح کسی حافظ قرآن کا بیٹا خود قرآن حفظ کیے بغیر اپنے نام کے ساتھ ''حافظ'' نہیں لکھ سکتا۔

ڈاکٹر ساگا 7 زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اُن کا نام بیرونی ثقافتی وفود میں ڈالنا خود سیکرٹری صاحبان کی مجبوری تھا۔ کیونکہ باہر جا کر ساگا صاحب سارا کام خود سنبھال لیتے تھے پاکستان کو متعارف کروانے کا اور سیکرٹری صاحبان اور اُن کی بیگمات شاپنگ کے لیے کھُلا وقت پاتے تھے۔ پاکستان کے بارے میں ہر مشکل سوال کا جواب دینا ساگا صاحب کا ہی فرض تصور کرلیا گیا تھا۔ طائفے میں شامل کچھ لڑکیاں سیکرٹری صاحبان کی سفارش پر بھی ہوتی تھیں جو ہوٹل میں موقع ملنے پر ساگا صاحب کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ اسے بھی فن رقص کی ''جاگ'' لگا دیں مگر ساگا صاحب خود بیٹیوں والے تھے اس لیے ''کھُسرا'' یا ''نامرد'' کہلوانا گوارا کر لیتے تھے مگر غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔ یہی مواقع عطاء الحق قاسمی کو ملے ہوتے تو اُن کے مونہہ کے آگے BIB باندھنا پڑتا۔

اپنی شادی کے بارے میں بتاتے تھے کہ مجھے خاندان میں کوئی بیٹی دینے کو تیار نہ تھا۔ خود میرا سالا یہ جانے بغیر کہ کل یہ میرا ہی بہنوئی ہوگا میرے ساتھ جنسی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ لاہور سے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) بس سروس ہماری اپنی تھی۔ ہم دونوں بس میں فری جاتے۔ میرا سالا مجھے ایک ہاتھ میں کلفی پکڑاتا اور دوسرے ہاتھ میں ''کلفہ'' پکڑاتا۔ مجھے بھی اُس وقت یہ اتنا بُرا عمل نہیں لگتا تھا۔ جب میری شادی ہوگئی تو میں اور میرا سالا ایک دوسرے سے شرمانے لگے۔

ڈاکٹر ساگا اپنی ضرورت مند شاگردوں کو کاسٹیوم وغیرہ اپنی گرہ سے خرید دیتے تھے تاکہ یہ فن کسی نہ کسی طرح چلتا رہے۔ میں نے انہیں اپنے سسرالی رشتہ داروں کی ایک دعوت ولیمہ میں ڈانس کرنے کا کہا تو وہ بلا معاوضہ پُرفارم کرنے پر تیار ہو گئے اور بروقت اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ آ بھی گئے مگر ہمارے رشتہ دار مولوی ٹائپ تھے انہیں اسلام خطرے میں نظر آیا۔ اس طرح یہ پرفارمنس نہ ہوسکی۔ میرا خیال تھا کہ ساگا صاحب اس بات کا بہت برا مانیں گے مگر انہوں نے اس حوالے سے دوبارہ کبھی بات نہ کی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ مجھے ایک بار مجلس میں بھی لے گئے۔ یوں میرے تجربے میں آنسوؤں بھرا اضافہ ہوا مگر ہاتھ قیمہ والے نان کے اور کچھ نہ آیا۔ حضرت امام علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی دل میں عظمت و عزت وہی رہی جو پہلے سے تھی۔ اُس کا گراف نہ اوپر گیا نہ نیچے آیا۔

اپنے گھر تمام دوستوں کی میں نے مچھلی پارٹی کی۔ ساگا صاحب نے یہ محفل اپنی باتوں سے ہی لوٹ لی۔ آج بھی میرے دوست اس محفل کو یاد کرتے ہیں۔ خاموش رہنا اور نچلا بیٹھنا اُن کے لیے امر محال تھا، پارہ بھرا تھا اُن کے جسم میں۔ ڈاکٹر ساگا ریٹائر ہو چکے تھے۔ ''تمغۂ حُسنِ کارکردگی'' مل چکا تھا۔ ''پنجاب کے لوک رقص'' گورا پبلشرز نے پرنٹ کردی تھی۔ ساگا صاحب بہت مطمئن اور خوش تھے۔ کبھی کبھی اپنے پائلٹ بیٹے راغب ساگا کو یاد کرکے بہت روتے تھے جو زیر تربیت تھا اور اُس کا طیارہ حادثے کا شکار ہوگیا۔ چونکہ اُس کی نوکری ابھی پکی نہ ہوئی تھی اس لیے ساگا صاحب کو اُس کی لاش کے علاوہ کچھ نہ ملا۔

ساگا صاحب کتنے بڑے فنکار اور کمیٹیڈ انسان تھے اس بات کا پتہ لوگوں کو ایسے چلا کہ وہ سٹیج پر طے شدہ پروگرام میں اپنی

پرفارمنس دینے کے بعد زاروقطار رونے لگے۔ تمام حاضرین اور انتظامیہ دُکھی ہو گئے اور ساگا صاحب کی طرف سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ساگا صاحب نے مائیک پر آکر رونے کی جو وجہ بتائی اُس نے تمام مجمع کو رُلا دیا: ''آپ کو پتہ ہے؟ آج میرا بیٹا وطن کی آن پر قربان ہو گیا'' وجدان و الہام کو محض مذہبی تناظر میں ہی لکھا، بولا اور پڑھا جاتا ہے مگر میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں وجدان اور وجدانی کیفیت تمام فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، آرٹسٹوں اور دیگر متعلقین فنونِ لطیفہ کا بنیادی وصف ہوتا ہے جو اُن کو عام انسانوں کی سطح سے اٹھا کر بلندی پر لے جاتا ہے۔ وَجد کی کیفیت جتنی پرزور اور معروض سے غیریت پیدا کرنے والی ہوتی ہے اُتنی ہی بلند پایہ تخلیق معرضِ وجود میں آتی ہے۔ فقیر حسین ساگا بھی اپنے وجدومستی میں ڈوبے رہے تو لازوال پرفارمنس دینے والے بنے رہے مگر جب معروض سے راغب حسین ساگا شہید کی موت سے تعلق جڑا تو آبگینہ ایسا ٹوٹا کہ پھر نہ جڑ سکا۔

ذہین لوگوں سے جلنے والے لوگ ''جنرل ضیاع'' کی طرح جل کر ہی مرتے ہیں اور فن کے نام پر زندہ رہنے والے فن کے نام پر ہی مرتے ہیں۔ افسانہ نگار رحمن مذنب اور ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کی موت میری نظر میں اُن بہترین اموات میں سے ہیں جو اچانک ہوئیں اور فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوئیں۔ رحمن مذنب اپنے رائٹنگ ڈیسک پر بیٹھے لکھنے میں مصروف تھے۔ بسنت بہار کے دن تھے۔ کسی کی کٹی پتنگ اُن کے گھر آکر گری۔ وہ پتنگ اُٹھانے اُن کے گھر کودا۔ پتنگ سے پہلے اُس کی نظر مذنب صاحب کے گرے ہوئے سر پر پڑی جو رائٹنگ ٹیبل پر دھرا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ معاملہ خراب ہے۔ اُس نے گھر والوں کو بتایا اور رحمن مذنب صاحب کی موت کی تصدیق ہو گئی۔

اسی طرح ڈاکٹر فقیر حسین ساگا بھی تابندہ ماڈل سکول بُورے والا کے ہال میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دن بسنت بہار ہی کے تھے۔ محفل اپنے عروج پر تھی۔ حاضرین رات کے خُمار میں ڈاکٹر ساگا کی پُرفارمنس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ساگا مینا کماری کی فلم پاکیزہ کے مشہور گانے: ''چلتے چلتے'' پر پُرفارم کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ساگا ڈانس کرتے کرتے زمین کی طرف جھکے۔ سب نے سمجھا ڈاکٹر ساگا نے ڈانس کا کوئی ایکشن دیا ہے۔ تالیاں بجیں۔ مگر گرنے والا پھر اُٹھ نہ سکا۔ یہ HEART ATTACK نہیں HEART FAILURE تھا۔ مجھے یقین ہے اُن کی روح بھی رقص کرتی ہوئی آسمانوں میں داخل ہوئی ہو گی اور کسی فرشتے کے ہاتھ نہیں آئی ہو گی۔ ایک منٹ میں اپنے پاؤں کی ایڑی پر درجنوں چکر لے جانے والا بھلا کسی کے قابو میں کہاں آتا ہے!

شیزان کی ایک شام

لاہور میں ضیا دور کے دوران مسجدوں کو پہلی بار بم دھماکوں کے باعث تالے لگے۔ بعد میں اچھے سینما گھر بند ہوئے اور پھر اچھے ہوٹلوں کی باری آئی۔ دیال سنگھ مینشن، ریگل چوک، لاہور میں واقع شیزان ریسٹورنٹ ادیبوں کے بیٹھنے کی اچھی جگہ شمار ہوتا تھا۔ شیزان کے نذرِ آتش ہونے سے پہلے جس آخری ادبی تقریب میں شرکت کی وہ کئی حوالوں سے آج بھی یادوں میں تازہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ''میری یادداشت'' مشکوک ہو جائے، میں اُسے اَدبی قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس فنکشن میں فکشن کے بڑے بڑے نام شریک تھے جواب تیزی سے اگلی دنیا سُدھارنے لگے ہیں بہتر یہی ہے کہ کیمرہ کلوز کر دیا جائے۔

جس تقریب کا ذکر میں کرنے جا رہا ہوں وہ مئی کے گرم دنوں میں شام ساڑھے پانچ بجے شروع ہوئی۔ شیزان کا اوپر والا ہال ادیبوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ تقریب تو ڈاکٹر صدیق جاوید کی پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمن کے خلاف تحریر کردہ کتاب ''تحقیق کے چراغ تلے'' کے حوالے سے تھی مگر رونق تیل مہندی والی تھی۔ سب جماعتیے خضاب لگا کر، ضیاء الحق کے فوجی سٹاک سے بچا ہوا سرمہ، آنکھوں میں ڈالے، کھال سے کھال ملا کر شریک ہوئے تھے۔ اس تقریب کی سپانسر شپ خفیہ طور پر ''منصورہ'' نے کی تھی۔

جماعتی حلقوں میں اس تقریب کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کو بھاگم بھاگ تہران سے لاہور آنا پڑا تھا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی ڈاکٹریٹ کے حوالے سے یہ شعر سُن رکھا تھا:

جب سے اے تحسین فراقی تیرے سپرد ہُوا
عبدالماجد دریا بادی، دریا بُرد ہُوا

اس تقریب میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا استقبال نصرت فتح علی خان کے مشہور گانے ''میرا پیا گھر آیا'' سے کیا گیا۔ وہ دیگر جماعتیوں سے اس بات کی داد وصول کر رہے تھے کہ تہران میں اُن کی فرتیح جلد بازی کے باعث کُھلی کی کُھلی ہی رہ گئی مگر اس تقریب کا قضا ہو جانا انہیں کسی بھی صورت منظور نہ تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمن سے زِک اُٹھانے والے، معین الرحمن کے اُٹھانے والے اور معین الرحمن کو LATER ON رکھنے والے سبھی تو موجود تھے۔ خود صاحب کتاب صدیق جاوید ڈاکٹر معین الرحمن کا تھیلا اُٹھانے کا عالمی ریکارڈ رکھتے تھے۔ فیصل آباد اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج، لاہور میں بھی معین الرحمن کی مالش چمپی کرتے رہے تھے۔ اُن کے ضمیر نے انہیں چموٹے مارے بھی تو اُس وقت جب محمود و ایاز دونوں ہی ریٹائر ہو چکے تھے۔ صبح کا بھولا اگر صبح ہی واپس آ جائے تو اُسے MQM کہتے ہیں اور اگر آدھی رات کو پولیس کے ہاتھوں مرغا بننے کے بعد گھر واپس آئے تو اُسے صدیق جاوید کہتے ہیں۔ صدیق جاوید نے شاہی فلم سٹوڈیو (نیا نام ''منصورہ'') کی ایک دیوار سے یہ شعر نوٹ کر کے اپنی سٹڈی میں لکھوا رکھا تھا:

آج پھر جینے کی تمنا ہے
آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

ڈاکٹر صدیق جاوید جو پرسنیلٹی کے اعتبار سے چونگی ملتان روڈ کے منشی لگتے تھے تقریب شروع ہونے سے پہلے اپنی کتاب شرکاء میں VISITING CARD کی طرح بانٹ رہے تھے۔ مالِ مفت دل بے رحم والا معاملہ تھا۔ کتاب پر رقم جماعت کے کھال

فنڈ سے لگی تھی جس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ صدیق جاوید نے ایک بار گرودوارے کی طرح منصورے کی خدمت والی ڈیوٹی بھی کی تھی۔ صدیق جاوید جو کھالیں اکٹھی کر کے جماعت کے مال خانے میں جمع کروانے گیا وہ مال خانے کے انچارج نے وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا تاہم صدیق جاوید کا اصرار تھا کہ اُس کی عقل کو نہیں اُس کے خلوص کو اُسی طرح سراہا جائے جیسے میاں طفیل محمد کے خلوص کو مولانا مودودی نے یہ کہہ کر سراہا تھا: ''خدا نے تمہارے دماغ میں عقل کی جگہ خلوص بھر دیا ہے،'' مگر وقت اور شخصیات میں بہت زیادہ فرق تھا۔ مال خانے کے انچارج نے جب صدیق جاوید کو کھالوں کے نام سنگین مذاق کرنے پر سخت نتائج کی دھمکی دی تو صدیق جاوید جیسے چیچڑ اور لیچڑ کو وہاں سے ٹلتے ہی بنی۔ ایک جماعتیہ دوسرے جماعتیے سے کہاں تک لڑ سکتا ہے؟ مال خانے کے انچارج نے صدیق جاوید پر واضح کر دیا تھا کہ وہ برائلر مرغی کی کھال اور ختنہ والی کھال میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ جماعت جس کھال میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتی تھی وہ جنرل ضیاء کی تھی جو اسے آتش زدگی کے باعث ملی نہیں ورنہ توڑی بھرا جرنیل کسی کو ڈراتا نہ بھی، ہنساتو سکتا تھا ناں۔ منصورہ میوزیم کی شان بڑھاتا اور فوج کا بھی اس بہانے منصورہ آنا جانا رہتا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے اس تقریب کے لیے DAWN TO DUSK کام کیا تھا۔ شیزان کی اس تقریب میں شرکاء کی بھاری تعداد اُن کا خون بڑھا رہی تھی اور اُن کے منی ایچر کورونش کیے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو معین الرحمن کے قریبی معتمد اور وعدہ معاف گواہ کے طور پر بلایا تو گیا تھا مگر TIME CLASH کی وجہ سے وہ اپنے جگر وٹ سیّد مشکور حسین یاد (استادِ محترم میاں ڈاکٹر حکیم محمد نواز شریف، وزیر اعظم پاکستان) کے اعزاز میں الحمراء میں ہونے والی تقریب میں رکشا کر کے جا پہنچے تھے۔ اُن کے رکشانے جب الحمراء والے اشارے پر بریک ماری تو اُن کے سامنے ایک اور رکشا لگا،، جس پر لکھا تھا: ''چل نیں چل، مشکورا تے میرا اے'' ڈاکٹر سلیم اختر کو شک گذرا کہ ہونہ ہو اس رکشا میں راحتِ جاں ڈاکٹر انور سدید اُن پر بازی لے کر جا رہا ہے۔ خیر گذری جب اُس میں سے شاعری کے تین شاہ، فرحت عباس شاہ، سعد اللہ شاہ اور وصی شاہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہنستے کھیلتے برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے سکون کا گہرا سانس لیا اور سٹیج پر کرسی سنبھال لی۔ مشکور حسین یاد کو بھی بروقت آمد پر چھپے کا مشکور ہونا پڑا۔ جماعتیوں کی ذہانت لائقِ داد تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی خالی نشست دی بھی تو کس کو؟ ڈاکٹر انور سدید کو جن سے ڈاکٹر سلیم اختر خواب میں بھی باوضو ہو کر ملتے ہیں۔ اگر ان دونوں تقریبات کی کوریج کوئی چینل براہ راست کر رہا ہوتا تو ڈاکٹر سلیم اختر اپنی جگہ ڈاکٹر انور سدید کو دیکھ کر بے ہوش نہ بھی ہوتے تو انہیں ''دندل'' لازمی پڑ جاتا تھی۔

تقریب کی آڈیو ریکارڈنگ کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے خود لی تھی اور وہ اپنے ہم وزن ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ جس مستعدی سے ریکارڈنگ میں مصروف تھے وہ وقت اور عمر کی قید سے آزاد تھی۔ پہلے تو ریکارڈنگ کرنے کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی اس لیے کہ پوری جماعت، باجماعت اس تقریب میں موجود تھی پھر ریکارڈنگ چہ معنی دارد؟ جب تقریب سے لمبی رخصت پر غیر حاضر ایک اَدبی کم جماعتی پہلوان ڈاکٹر وحید قریشی کا نام ذہن میں فلیش ہوا تو سب سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا نے اتنی بھاری بھرکم ٹیپ کسی بھاری بھرکم شخصیت ہی کو رُوداد سنانے کے لیے اُٹھا رکھی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اُن کے وہ محسن تھے جنہوں نے انہیں زمانۂ طالب علم میں اسلم انصاری جیسے ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل طالب علم پر برتری دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور خواجہ ایم۔اے (اُردو) میں گولڈ میڈل کے حق دار قرار پائے تھے۔ یہ گولڈ میڈل بعد ازاں اُن کی باقی ماندہ زندگی کو بھی سنہرا بناتا

رہا۔ انسان کو محبت اور دوستی دکھانے اور جماعت سے وفاداری نبھانے کی خاطر کیا کیا کھیل رچانے پڑتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کی ڈیوٹیاں ریٹائر ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتیں۔ اُن کا فانی جسم تو کرسی چھوڑ کر ادارے سے باہر آ جاتا ہے مگر روح بدستور بریک ڈانس کرتی اور مالش چمپی میں مصروف رہتی ہے۔

یہ تقریب ویسی ہی جذباتی تھی جیسا اس کو جماعتی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔ بھاری اکثریت کیا گل کھلا سکتی ہے، یہ تقریب اس کی درخشاں مثال تھی۔ بہت کچھ واہیات بکا گیا، ڈاکٹر معین الرحمن سے متعلق۔ G.C یونیورسٹی کے صرف ایک استاد شیر محمد گریوال نے معین الرحمن کے حق میں آواز بلند کی مگر یہ آواز، ستی ہونے والی بیوہ کی چیخوں کی طرح ''ہری اوم''، ''ہری اوم'' کے نعروں میں دبا دی گئی۔

ڈاکٹر سلیم اختر جانے کو تو سیّد مشکور حسین یاد کے فنکشن میں چلے گئے تھے مگر اُن کا دل بُری طرح شیزان ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑا کر رکشے میں شیزان کے لیے نکلے۔ لاہور میں پرویز الٰہی کی وجہ سے رکشے آوارہ کتوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ اس بار اُن کے سامنے جو رکشا لگا اُس کے پیچھے لکھا تھا: ''نی او فیر آ گیا۔'' ڈاکٹر سلیم اختر کے پاس رکشا کی سرخی پر غور کرنے اور رُکنے کا وقت نہ تھا۔ وقت تیزی سے اُن کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ لپکتے جھپکتے خود کو سنبھالتے شیزان پہنچے۔ اپنی جگہ ڈاکٹر انور سدید کو بیٹھے دیکھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور عام حاضرین میں بیٹھ گئے۔ تقریب آخری دموں پر تھی۔ ساڑھے پانچ سے دس بج چکے تھے۔ اب تو شیزان کے ویٹر بھی معنی خیز اشارے کرنے لگے تھے۔ انہیں اس تقریب کے جماعتی یا غیر جماعتی ہونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سٹیج پر بیٹھے بزرگوں کی نظر جب ڈاکٹر سلیم اختر پر پڑی تو سب سے آخر میں انہیں خطاب کی دعوت دی گئی۔ حاضرین کے صبر کا پیمانہ کبھی کا لبریز ہو چکا تھا۔ شوگر کے مریض المعروف میٹھے میٹھے بھائی اپنے مثانے کی پکار اور شوگر لیول گر جانے سے الگ نڈھال اور بے حال تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اپنے وسیع تقریباتی تجربے کی روشنی میں خود ہی اندازہ ہو گیا کہ عوام مزید سمع خراشی کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے بڑی سرعت کے ساتھ وائنڈ اپ کرتے ہوئے سٹیج چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے تو تقریب کے آخر میں ''رقصِ درویش'' کا پروگرام بھی بنا رکھا تھا اور بہت سے باریش بزرگ اس فل دھما کہ پروگرام کے لیے خود کو ٹیون اپ بھی کر رہے تھے مگر اکثریت اب دیکھنے سے زیادہ پینے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ چائے جانے کب سے تیار تھی اور اپنا آپ منوانا چاہتی تھی۔

تقریب کے شرکاء نے جس طرح پیسٹریوں کی عزت لوٹی اور شامی کبابوں کے ساتھ بدفعلی کی وہ الگ سے دلگداز داستان ہے۔ اس تقریب کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ ہی عرصے بعد پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمن انتقال کر گئے۔ نستعلیق قسم کے نازک مزاج آدمی تھے، جیسے کسی زمانے میں خشبویات سے غسل کرنے والے نواب ہوا کرتے تھے جنہیں مارنے کے لیے کسی بھنگن کا غلاظت بھرا ٹوکرا لے کر اُن کے سامنے سے گذر جانا ہی کافی ہوا کرتا تھا۔ کیا ہی اچھا اور شفاف طریقہ ہوتا اگر ڈاکٹر صدیق جاوید بھی کتاب لکھنے کی مشقت اُٹھانے کی بجائے سبزی کا تھیلا اُٹھائے ڈاکٹر معین الرحمن کے گھر جاتے تو عین ممکن تھا معین الرحمن انہیں دہشت گرد سمجھ کر اُسی وقت تھاں مر جاتے!!!

اُستاد سیف اللہ خالد کے اعزاز میں

اللہ میرے حال پر رحم کرے اس تاثر، مضمون، خاکہ یا یہ جو کچھ بھی ہے اس کا پہلا جملہ یعنی عنوان ہی غلط لکھنے لگا تھا جو حملہ بن جانا تھا میری ممدوحہ شخصیت پر۔ بس ایک آدھ لفظ کی غلطی عرفان کو شیطان کی طرح مہنگی پڑ جانی تھی۔ میں اپنی غلطی کی براہِ راست نشاندہی تو نہیں کروں گا کہ اس سے میری شان پر کنیاں پڑتی ہیں۔ ویسے تو شان، نیلوکا ہو یا شان، عرفان کی اکثر خطرے ہی میں رہتی ہے۔ میں اپنا غلط جملہ لکھنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ ورنہ یہ قاری کی عقل و فراست کا امتحان اور ایک غیر انعامی معمہ سا بن کر رہ جائے گا...... میرا جملہ کم و بیش اُس جملے سے ملتا جُلتا تھا جو ایاز نے محمود کی فرمائش پر کہا تھا۔ محمود نے ایاز کو ایسا جملہ کہنے کو کہا تھا جسے وہ خوشی میں سُنے تو دُکھ محسوس کرے اور دُکھ میں سُنے تو خوشی محسوس کرے۔ ایاز کا جملہ کچھ ایسے تھا: ''یہ وقت ہمیشہ نہیں رہے گا'' (جو بعد ازاں اَز حد متاثر ہو کر محمود نے اپنی انگوٹھی پر کندہ کروا لیا تھا) جو جملہ میں لکھتے لکھتے رہ گیا اُس کی خالی جگہ پُر کریں تو خوشی اور دُکھ کی کیفیت لیے کئی الفاظ ہمارے ذہن میں حاضری لگوانے آن کھڑے ہوں گے اور حاضری لگتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے کیونکہ خالی جملے میں کسی بھی لفظ کو مستقل جگہ نہیں دی جا سکتی۔ ''باعزت بری'' اور ''سینسر نے بخوشی پاس کر دیا'' والا جملہ تو کئی بار پڑھا اور سنا تھا لیکن ''باعزت ریٹائرمنٹ'' والا معاملہ کبھی کبھی ہوتا ہے جو سیف صاحب کے ساتھ ہوا ورنہ یہیں علی ظہیر منہاس جیسی منحوس مثال بھی موجود تھی جس کی وِگ کئی بار ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور چُندیا کئی چاند تھے سرِ آسماں کی طرح چمکائی گئی۔ اُس کی رُخصتی ذلیل و خوار ہو کر عمل میں آئی۔ اُس ریٹائرمنٹ کو میں ریٹائرمنٹ نہیں مانتا جو ایکسٹینشن کی بیساکھیوں پر دس، پندرہ سال اور نکال جائے۔ ہمارے آرمی چیف صاحبان ''بے عزت ریٹائرمنٹ'' کی درخشاں مثال ہیں جو اُسے قانونی شکل دینے کی بجائے اپنے اپنے لیے ایکسٹینشن کا ''بہشتی دروازہ'' کھلواتے رہے۔

اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور میں کارنر والا کمرہ جو کارنرز میٹنگز کیلئے ہی استعمال ہوتا تھا سیف اللہ خالد کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا کہ اس کا حق صرف اسی بندے نے ادا کیا باقی سب بارات کے ساتھ پیسے لوٹنے والے تھے۔ اُن میں سے ایک صاحب تو ایسے بھی تھے جو Ph.D کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اپنے مسترد شدہ تھیسس کو وہاں فروخت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ جو چیز ساحل کی لطافت کو نہ پا سکے اُسے غرقِ بحر ہی ہو جانا چاہیے۔ سیف اللہ خالد کے اس کمرے کو ''ہائیڈ پارک کارنر'' کا عوامی نام بھی دیا گیا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور کے معتبر جریدے: ''فاران'' کی تدوین و تکمیل اسی تاریخی کمرے میں تمام مراحل طے کرتی تھی۔ سیف اللہ خالد نام تو ایسا ہے جو کسی فوجی جرنیل، کرنیل کو زیادہ سوٹ کرتا ہے مگر سیف اللہ خالد کو ''فاتح فورٹ عباس'' تو نہیں مگر ''مولودِ فورٹ عباس'' تو 100% ہیں اس طرح اُن میں پیدائشی طور پر جرنیلی شان پیدا ہو چکی ہے۔ سیف اللہ خالد کی جرنیلی شان اُس وقت دیکھنے لائق تھی جب وہ پاکستان کے صفِ اوّل کے کالم نگار عطاء الحق قاسمی کے سامنے اپنے مضمون: ''شہابِ بے نقاب'' کی ننگی تلوار لئے کھڑا تھا اور ڈکٹیشن پر لکھنے والے قاسمی کا مضمون دیکھ کر پیشاب خطا ہو رہا تھا۔ پانی کی یہ کمی قاسمی نمکول کی بجائے چھچھی چھچھی شراب پی کر

پوری کرر ہا تھا جس کی درجنوں بیٹیاں وہ ناروے سے لایا تھا۔ دیسی کُکڑ ابرار ندیم اسحرؔ الگ دیوار سے لگا کانپ رہا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نایاب نسل کے گنجے شیروں کی شریفانہ جوڑی مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو گئی تھی اور بھینگا سرکس ماسٹر جو 90 دن کے ٹکٹ پر موت کے افغانی کنوئیں میں گیارہ سال تک سائیکل چلاتا رہا تھا آموں کے لالچ میں بستی لال کمال کو پیارا ہو چکا تھا۔

عطاء الحق قاسمی اُن دنوں صرف کالموں کی کمائی پر زندہ تھا۔ پروفیسر سیف اللہ خالد کے مضمون میں اُسے 1122 والی کئی گاڑیوں کے سائرن بجتے نظر آئے۔ اُس نے مضمون اپنے اَدبی پرچے ''معاصر'' میں شائع کرنے سے معذرت کر لی جہاں وہ کچھ ہی عرصہ پہلے فیض احمد فیضؔ کے خلاف اَدبی جنگ بڑے احترام سے لڑوا چکا تھا۔ سیف اللہ خالد نے جس نیام سے مضمون کی تلوار نکالی تھی اُسی نیام سے ایک سال بعد ''شہاب بے نقاب'' کتاب نکالی۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کا اپنی جگہ ایک شاہکار ہے اور اُن ہزاروں قصیدوں پر بھاری ہے جو انعام و اکرام کے لالچ میں کسی بھی دور میں جانے کن کن مقدّس ہاتھوں سے لکھے گئے۔

سیف اللہ خالد کا یہ کارنامہ کچھ ایسا تھا کہ جو لوگ محض اُن کے واقف تھے اُن کے قریبی دوست ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ایسا ہی ایک دعویٰ ڈاکٹر امجد طفیل نے بھی کیا جو راقم کے صرف 2 سوالوں کی مار ثابت ہوا۔ ڈاکٹر امجد طفیل سے پوچھا گیا کہ وہ سیف اللہ خالد کا فون نمبر بتا سکتے ہیں؟ نیز یہ کہ ان کا مکان نمبر کیا ہے؟ ڈاکٹر امجد ان دونوں سوالوں کے جواب نہ دے سکے۔ جبکہ انہیں LIFE LINE بھی دی گئی اور MEMORY CARD کی مدد سے یہ انڈین گیت بھی سنوایا گیا: ''میرے سوالوں کا جواب دو۔ دو ناں۔ دو ناں'' اور یہ HINT بھی دی گئی کہ سیف اللہ خالد کے فون نمبر اور گھر کے نمبر میں ایک تین ہندسوں والا عدد مشترک ہے۔ اس دو سوالاتی پروگرام کی میزبانی مشہور آرٹسٹ ریاظ کر رہے تھے۔ اب چونکہ یہ راز، راز نہیں رہا اس لئے تجسّس پسند اور سسپنس کے مارے ہوئے قارئین نوٹ فرما لیں سیف اللہ خالد کا لینڈ لائن نمبر تا دمِ تحریر 042-37460100 ہے اور اُن کے گھر کا پتہ کچھ اس طرح سے ہے: 100-F گلشنِ راوی، لاہور۔ ڈاکٹر امجد طفیل اپنی آواز کی کرختگی سے اپنی لاعلمی پر جب بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کریں گے تو خود اُن کا نرخرہ اور دوسرے کے کان کا پردہ پھٹ جانے کے امکانات کو رَد نہیں کیا جا سکتا۔

سیف اللہ خالد کے فن اور شخصیت پر میں اس لیے کچھ زیادہ روشنی یا پانی نہیں ڈال رہا ہوں کہ اُن پر ایم۔ فل کا تھیسس اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور سے ہو چکا ہے۔ میں تو اُن کی بھاری بھرکم شخصیت کو ہلکا پُھلکا بناتے ہوئے اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی ادنٰی سی کوشش کر رہا ہوں۔ پُھلکے سے یاد آیا اب تو کوئلے والی انگیٹھی پر اُلٹے توے والے پُھلکے، پُھولنے ہی بند ہو چکے ہیں جو شوقین مزاج چھوٹے گوشت کے شوربے کے ساتھ بہ طور خاص کھایا کرتے تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں جہاں اور بہت سے تضادات تھے وہیں یہ بھی تھا کہ مغربی پاکستان میں کسی بیمار کو ہلکی غذا کے طور پر چاول میں مونگ کی دال ڈال کر کھچڑی بنا کر دی جاتی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں جہاں لوگ تین وقت موٹا یا ٹوٹا چاول کھاتے تھے وہاں مریض کو پُھلکا بنا کر دیا جاتا تھا۔ کچھ یہی فرق صحرائی اور میدانی علاقے سے تعلق رکھنے والے نفوس میں بھی پایا جاتا ہے۔ گو سیف اللہ خالد کو لاہور میں رہتے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر اُن کے اندر کا صحرائی سانپ کبھی کبھی اپنا پھن بھی پھیلاتا ہے اور شوکریں بھی مارتا ہے۔ اُس وقت ''معززین شہر'' کو ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ ''معززین شہر'' کی تعریف ضلعی انتظامیہ کے نزدیک کیا ہے؟ یہ ایک علیحدہ سے تحقیق طلب موضوع ہے۔

2 باراُن کے گھر تبلیغی جماعت والے بھی حسبِ روایت بن بلائے تشریف لائے اور دونوں بار سیف صاحب نے اُنہیں بڑی دانشمندی اور فہم وفراست سے چلتا کیا۔ پہلی بار تبلیغی جماعت کے سربراہ نے انہیں کلمہ سنانے کو کہا تو سیف صاحب نے کہا: ''کلمہ بدل گیا ہے؟'' یہ سنتے ہی جماعت نے با جماعت راہِ فرار اختیار کی۔ دوسری بار جب تبلیغی جماعت سے سیف اللہ صاحب کا ٹاکرا ہوا تو تبلیغی جماعت کے قائد نے حلق کی دسویں گہرائی سے آواز نکالتے ہوئے اپنا نام ''مطیع اللہ'' بتایا تو جواب میں سیف صاحب نے اپنا تعارف: ''متھرا داس چوہان'' کہہ کر کروایا تو پوری تبلیغی جماعت سناٹے میں آ گئی۔ ''مگر گھر کے باہر تو سیف اللہ خالد.............؟'' تبلیغی جماعت کے قائد نے تھوک نگلتے اور وضو ٹوٹنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے بمشکل کہا۔ ''یہ میرے مالک مکان کا نام ہے۔ میں اُن کا کرایہ دار متھرا داس چوہان ہوں'' سیف صاحب نے رسانیت سے جواب دیا۔ ویسے بھی جب جان یا ایمان خطرے میں ہو تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ وہ دن اور آج کا دن سیف اللہ خالد کا گھر تبلیغی جماعت کی حد تک محفوظ قرار پا چکا ہے۔

سیف اللہ خالد کو روٹین سے ہٹ کر کام کرنے کی عادت ہے بلکہ ہٹ ہٹ کر کرنے کی۔ اسی عادت نے انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد جلد ہی دل کا مریض بنا دیا۔ ایک روز اچانک 1122 میں دل وارڈ پہنچے۔ ہنستے کھیلتے دو STENT ڈلوائے اور گھر آ گئے۔ ''میزانِ ادب'' سیف صاحب نے میڈم نور جہاں کے قول: ''مینوں نوٹ وَخا میرا موڈ بنے'' کو سامنے رکھ کر تیار کی تھی جس کی نقل بعد میں غلام حسین ساجد نے ''فیضانِ ادب'' کے نام سے تیار کی۔ نقال کا تو کچھ نہیں بنا لیکن سیف صاحب نے ''میزانِ ادب'' سے اپنا گھر بنا لیا مگر محنت کی ایسی عادت پڑی کہ اب دل کی نہ سنتے ہوئے بھی کئی کام REST کے طور پر کر جاتے ہیں۔ میں نے اُن کی ایسی کئی بد پرہیزیاں پکڑی ہیں مگر بات اُن کے گھر تک نہیں جانے دی کیونکہ اُن کے گھر والے پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ کتاب دینے کے معاملے میں اَز حد کنجوس ہیں مگر مہمان نوازی میں اس کی کسر نکال دیتے ہیں۔ اشفاق احمد کی طرح اکیلے نہیں بولتے دوسروں کو بھی پورا پورا موقع دیتے ہیں۔ اگر انہیں آنکھیں بند کر کے سُنا جائے تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کوئی فلپس ریڈیو پر آل انڈیا اُردو سروس آف کرنا بھول گیا ہو ورنہ وہ تو دوسروں کی بولتی بند کروا دینے والے آدمی ہیں۔

احمد ہمیش کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک ''افسانہ کانفرنس'' کروانے کی کوشش بھی کی مگر احمد ہمیش اُن دنوں ضیاء محی الدین کے کلاوے میں تھا ٹھیک سے ہاتھ پاؤں نہ مار سکا۔ اینجلا ہمیش کی پرسنیلٹی بھی اسپانسرز کو متاثر کرنے میں بُری طرح ناکام رہی بلکہ ENTRY TEST کی طرز پر نیگیٹیو مارکنگ کی حامل قرار پائی لیکن سیف اللہ خالد کا خلوص افسانے کے ضمن میں ہر جگہ سراہا گیا۔ یہ تو اُس کانفرنس کی بات ہے جو نہ ہو سکی۔ مگر جو کانفرنس رشید مصباح نے فیصل آباد میں کروائی وہ شرکاءمند دبین اور کھانے پینے کی حد تک تو کامیاب رہی مگر رشید مصباح کو اُس کانفرنس کی داد سمیٹنے کا موقع اِس لئے نہیں ملا کہ کانفرنس پرانٹر کے سینکڑوں طلباء کی داخلہ فیس کرپشن کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے غیر جمہوری انداز میں خرچ کر ڈالی گئی تھی۔ ''نہ گھنٹہ بجا نہ گھر بجا'' اس کانفرنس کا اعلامیہ اور المیہ سینکڑوں طالب علموں کا تعلیمی سال ضائع ہونا، رشید مصباح کی اپنی بیوی، کوٹھی، سواری اور بچوں سے دائمی محرومی بھی تھی۔ اگر اسی کا نام ترقی پسندی ہے تو لعنت ہے ایسی ترقی پسندی پر جو ایک سُرخے سیّد سجاد ظہیر کے ہاتھوں پروان چڑھی اور اب ایک جماعتیے ڈاکٹر سعادت سعید کے ہاتھوں مرنے چلی ہے۔ یہ ڈاکٹر ناول ''خدا کی بستی'' والا ڈاکٹر ہے، سلو پوائزننگ کرنے والا۔

احمد ہمیش بھی رشید مصباح جیسا ہی جنونی، جذباتی اور بلند فشارِ خون میں مبتلا لاعلاج مریض تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ افسانہ کانفرنس کے چکر میں اپنے ساتھ ساتھ سیف صاحب کو بھی لے بیٹھتا۔ اِس لئے ایسی افسانہ کانفرنس کے نہ ہونے ہی میں خاصے لوگوں کی عافیت اور باعزت بچت تھی۔

ہوسکتا ہے کہ سیف صاحب کو مجھ سے یہ گلہ ہو کہ میں نے اُن کے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' کیوں نہیں لکھا تو اس کی وضاحت یوں ہے کہ ''پروفیسر'' کا لفظ اپنے نام کے ساتھ صرف فل پروفیسر ہی لکھ سکتا ہے۔ فل پروفیسر کے علاوہ پروفیسر لکھنے پر انڈیا میں سزا ہو چکی ہے۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کو پروموشن دیتا پھروں۔ اگر میں صابر لودھی کو اس حرکت سے باز کروا سکتا ہوں تو سیف اللہ خالد کیلئے بھی کوئی استثناء نہیں۔

پاکستان میں تو شعبدہ باز اور سکولوں میں جادو کے کرتب دکھانے والے اپنے نام کا وزن بڑھانے کے لئے ''پروفیسر'' کا سابقہ اور ٹائیٹل استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال ارشد جاوید کی ہے جو اپنے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لکھتا ہے اور خود کو ماہر جنسیات قرار دیتا ہے۔ اس طرح تو پاکستان کا ہر ٹھرکی ''ماہر جنسیات'' ہے۔

سیف اللہ خالد تحریر و تقریر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود DOWN TO EARTH ہیں۔ لیفٹ، رائٹ دونوں کے مزے لینے کے بعد اب صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں۔ جو سمن آباد موڑ اور بند روڈ کے درمیان واقع ہے۔ واصف علی واصفؔ کے قریب رہنے اور کئی ذاتی ملاقاتوں کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہے۔ دوسروں کی کامیابیوں سے خوش اور اپنی زندگی سے مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ گن پوائنٹ ٹیکس کی صورت میں آخری خبریں آنے تک ایک کار اور ایک HONDA 125 قوم کو دے چکے ہیں۔ اب یہ قوم کی ہمت ہے کہ اِن سے مزید کیا کچھ نکلوا سکتی ہے!